تحسین فراقی *

عبدالستار صدیقی : نامور ماہرِ لسانیات، تہہ رس محقّق

عبدالستار صدیقی (۱۸۸۵ء۔۱۹۷۲ء) اردو کے ان نامور محققوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں جن پر ''یک در گیر و محکم در گیر'' کے قول کا بڑی خوبی سے اطلاق ہوتا ہے۔ انھوں نے زندگی طویل پائی مگر مقابلۃً کم لکھا تاہم جتنا لکھا اس پر ''قدرِ اول'' کی مہر ثبت کیے بغیر چارہ نہیں۔ ان کی تحریری تگ و تاز کا اصل میدان تاریخی و تقابلی لسانیات تھا اور اس باب میں ان کے علمی حاصلات ایک مدت تک اہلِ نظر سے خراجِ توصیف وصول کرتے رہیں گے۔ انھوں نے تاریخ کو تحقیق سے مربوط کیا۔ ان کا تحقیقی طریقِ کار گہرا تعقلاتی تھا، جذبات اور جذباتیت سے خالی اور خالصتہً علمی۔ تاریخی لسانیات پر ان کی نظر قابلِ رشک تھی۔ وہ عربی، فارسی، ہندی، پہلوی، سنسکرت اور انگریزی سے گہری آ گاہی رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں عبرانی، سریانی اور ترکی سے بھی کسی قدر واقفیت بہم پہنچائی۔ اردو، فارسی اور عربی کے لسانی امور ہی نہیں، ان زبانوں کے ادبیات سے بھی بخوبی آ گاہ تھے۔ دراصل عبدالستار صدیقی کے پایے کے علما اردو میں شاذ کے حکم میں داخل ہیں۔ مقالات صدیقی (پہلا حصہ)، معرّباتِ رشیدی (ترتیب) اور دیگر متعدد تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبدالستار صدیقی کو لفظوں کی عہد بہ عہد موجودگی اور ان کے اوضاع و تغیرات، فرہنگوں کی صحت و سقم، اپنی مخصوص علمی و لسانی اقلیم میں ہر دور کے لفظی و لسانی نظائر اور وضعِ اصطلاحات کے بصیرت افروز نکتوں کا کیسا گہرا شعور تھا۔

ان کے بعض مقالات لسانی معلومات کی کان ہیں۔ ان کے معاصرین میں یہ لسانی ذوق اور گہرا لسانی شعور حافظ محمود شیرانی، وحید الدین سلیم، سید سلیمان ندوی، احمد دین، مولانا سلیمان اشرف، پنڈت کیفی، شوکت سبزواری اور چند ہی اور انے گنے لوگوں میں تھا۔ پیشروؤں میں اس کی مثالیں سراج الدین آرزوؔ، انشا اللہ خاں انشاؔ اور محمد حسین آزادؔ کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ تقابلی لسانیات کے اولیں شواہد برعظیم میں آرزوؔ اور انشاؔ ہی کے ہاں ملتے ہیں۔

عبدالستار صدیقی کے معاصرین مثلاً حافظ محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا بادی اور متعدد دیگر حضرات ان کی لسانی خدمات اور اس باب میں ان کے تجّر کا لوہا مانتے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے معارف کے مارچ ۱۹۳۰ء کے شمارے میں ان کے بارے میں بالکل درست لکھا تھا:

> موصوف ہندوستان کے موجودہ مغربی سند یافتگانِ السنۂ شرقیہ میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ عربی زبان کے فقہ اللغہ (فیلالوجی) اور عربی اور سامی اور فارسی زبانوں کے باہمی تعلقات پر ان کو عبورِ کامل ہے۔[1]

چونکہ عبدالستار صدیقی نے اپنی متعدد انتظامی مصروفیات اور طلبہ و احباب کی علمی رہنمائی اور معاونت میں وقت کے کثیر حصے کے صرف کے باعث کم لکھا، اسی لیے ایک دوسرے موقع پر جب سید سلیمان ندوی نے ۱۹۳۹ء میں معارف اور ہندستانی میں ''بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق اور تہنید'' کے زیرِ عنوان دو قسطیں شائع کیں اور صدیقی صاحب نے ان پر استدراک رقم کیا تو سید صاحب نے دلچسپ انداز میں لکھا:

> علم میں خیّام کی طرح بخیل ہیں اور قلم کو بہت کم حرکت دیتے ہیں۔[2]

صدیقی صاحب نے سید سلیمان ندوی کے مذکورہ مقالے پر استدراک ہی نہیں لکھا، سید صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے نام ایک دلچسپ خط میں ان کے اس خیال سے اختلاف بھی کیا کہ ایک زبان میں در آنے والے دخیل الفاظ کو اُس زبان کے برتنے والے ''بگاڑ'' دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> میں دل سے ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ برا نہ مان جائیں مگر زبان کم بخت مانتی نہیں۔ ''بوتام'' ہمارا بڑا اچھا لفظ ہے، اسے ''بگاڑ'' کہنا تو کجا میں سُن نہیں سکتا۔ ہم جس لفظ کو اپنی زبان میں لیتے ہیں، اپنی زبان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ''بناتے'' ہیں یعنی ہماری زبان اسے اپنے ڈھب کا بنا لیتی ہے۔ اسے بگاڑنا کیونکر کہیے گا؟ اور ''بوتام'' میں تو یہ بھی نہیں۔ جس

> زمانے میں فرانسیسی ہندستان آئے، ان کی زبان سے پہلے پہلے (شاید ہندستانی سپاہیوں نے) بُوتون سنا۔ 'بٹن' بہت بعد کو انگریز لوگ لائے۔ اسی طرح ایک اور لفظ ہے ''کارتوس''، انگریزی میں ''کارٹ رِج'' اس سے ہمارا ''کارتوس'' ہرگز نہیں بنا۔ فرانسیسیوں سے ''کارتوش'' سن کر ہمارے سپاہیوں نے ''کارتوس'' تلفظ کیا۔ جیسے ''دیش'' سے ''دیس'' ہوا، ''کارتوش'' سے کارتوس ہوا۔ انگریز ''کمانڈانٹ'' بولتا ہے۔ اس کو فرانسیسی ''کوماں داں'' بولتا ہے۔ ''کمیدان'' کہا تو ہم نے اس کا کیا بگاڑا؟[3]

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک منجھے ہوئے ماہرِ لسانیات نے کتنے اہم لسانی اصول کی نشان دہی کیسے سلیقے اور کس علمی شان سے کی۔ اس اقتباس سے خوب اندازہ ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب تاریخی اور تقابلی لسانیات پر کیسی اچھی نظر رکھتے تھے۔

تاریخی اور تقابلی لسانیات سے صدیقی صاحب کی اطمینان بخش بلکہ حیران کن آگاہی کے شواہد مقالاتِ صدیقی اور متعدد دیگر تحریروں میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ دخیل الفاظ کے موضوع سے انھیں خصوصی دلچسپی تھی۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۹ء تک کم و بیش سات برس انھوں نے یورپ اور خصوصاً جرمنی میں گزارے تھے اور کلاسیکی عربی میں فارسی کے مستعار (دخیل) الفاظ کے زیرِ عنوان جرمن زبان میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا تھا جو ۱۹۱۹ء ہی میں جرمنی سے شائع ہوا تھا۔ اپنی اس کتاب اور بعض دیگر اہم تحریروں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا امتیاز علی عرشی کے نام ۲۵ اپریل ۱۹۴۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ۱۹۱۹ء میں میری کتاب جرمانی زبان میں (جرمانیا کے شہر گوءِ ٹنگن سے) شائع ہوئی تھی۔ اس کا نام انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے لکھتا ہوں: *Studies in Persian Loan-words in Classical Arabic* ۔ اس میں ان فارسی الاصل لفظوں پر بحث ہے جو جاہلیت کے زمانے سے لے کر اسلام کے ابتدائی زمانے تک فارسی سے عربی میں داخل ہو چکے تھے۔ اس مقالے میں فرداً فرداً لفظوں سے بحث نہیں کی گئی بلکہ تعریب وغیرہ کے اصول سے بحث ہے ...اگر آپ وہ بڑودے والی کتاب میرے لیے بھیج دیں تو ضرور آرامی اور عبرانی وغیرہ لفظوں کا تلفظ لکھ بھیجوں گا۔ وہ جرمانی کتاب آپ کو دیکھنے کو بھیج دیتا لیکن وہ آپ کے کس کام کی؟ ۱۹۳۰ء میں ایک مقالہ ابنِ دُرَید اور اس کے معرّ بات پر

شائع کیا تھا[۴]۔اس کا ایک نسخہ بھیجتا ہوں...اُسی سال مولوی سید سلیمان اشرف مرحوم کی کتاب المبین پر میں نے ایک تبصرہ رسالہ معارف میں لکھا تھا۔اس کے کچھ نسخے الگ بھی چھپ گئے تھے جو بٹ گئے۔ یہ نسخہ اس خیال سے آپ کو بھیجتا ہوں کہ شاید معارف کی جلدوں میں ڈھونڈ نا زحمت کا باعث ہو...

عربی مبین پر حرف آنے کا طوفان ہمارے بزرگوں ہی نے اٹھایا تھا۔اگرچہ اسی زمانے میں بعض محققوں نے اس کی تردید کردی تھی مگر وہ بات جو مذہبی عصبیت کی لَے میں ایک بار کہہ دی گئی تھی،لوگوں کے دلوں میں جم گئی۔اُس کی تردید کو کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا۔[۵]

یہ درست ہے کہ صدیقی صاحب نے زندگی میں کم نویسی کو اپنا شعار بنائے رکھا مگر بدقسمتی یہ ہے کہ جو لکھا ان تحریروں کی بھی صرف ایک جلد اب تک منظرِ عام پر آسکی حال آں کہ بقول مرتب مقالات کی تعداد اتنی تھی کہ دو مزید جلدیں شائع ہو سکتی تھیں مگر نہ ہو سکیں۔

زیرِ نظر مقالے میں ان کے مضامین کی جلد اول اور بعض دیگر مقالوں سے، جو رسائل و جرائد سے حاصل ہو سکے، اعتنا کیا گیا ہے۔ان تحریروں سے صدیقی صاحب کی گہری نظر اور غیر معمولی تعمّق و تبحّر کا بہ سہولت اندازہ ہوتا ہے۔ان تحریروں میں اگر مشاہیر کے نام ان کے علمی مکتوبات بھی شامل کر لیے جائیں تو ان کے علم و فضل کی زیادہ مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔سو میں نے ان کے غیر معمولی علمی مقام کے تعیّن میں ان مکتوبات سے بھی جا بجا مدد لی ہے۔حق یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے اگر عبدالستار صدیقی کو ''اساطینِ ادب''[۶] میں شمار کیا ہے تو کسی مبالغے سے کام نہیں لیا اور اگر ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ ان کے بے مثال علمی و لسانی مباحث کے حامل مکتوبات پڑھ کر اصمعی، ابنِ سلّام، ابنِ سیدہ اور ابنِ دُرَید کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، تو ایک بدیہی صداقت کے سوا کچھ نہیں۔

مقالاتِ صدیقی میں صدیقی صاحب کی ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۶۱ء تک کی تحریروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ جلد زیادہ تر لسانی مباحث پر مشتمل ہے مگر اس میں ایسے ایسے چشم کشا لسانی موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے کہ اُن کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ ہندوستان بغیر واؤ کے، بغداد کی وجہِ تسمیہ، لفظ سُغد کی تحقیق، ذالِ معجمہ فارسی میں، ولؔی کی زبان، اردو املا، بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق اور ان کے علاوہ افسوس (لفظ کا ایک بھولا ہوا مفہوم) معرّب لفظوں میں حرف ''ق'' کی حیثیت، تماہی کی ترکیب، وضع اصطلاحات پر تبصرہ اور معائبِ سخن کلامِ حافظؔ

کے آئینے میں وغیرہ کے مطالعے سے صدیقی صاحب ایک ایسے عالم لسانیات کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو شاید لفظ و لغات سے ہمہ وقت محوِ مکالمہ رہتے ہوں اور انھی سے ربط وضبط کو اپنا حاصلِ حیات سمجھتے ہوں۔تماہی کی ترکیب کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ اردو میں مستعمل ایسے لفظوں کا انبار لگا دیتے ہیں جو ایسی ہی تراکیب کے مماثل ہیں یعنی ایسی ترکیبیں جن میں ہندی اور فارسی یا عربی الفاظ کو مرکبات کی صورت میں ڈھالا گیا ہے۔ ''بارہ دری''، ''بارہ گزی''، ''تیس ہزاری باغ''، تپائی، تراہا، دوغزلا، تغزلا، ست خصمی، چھ ماہی، دُفصلا (جو درخت سال میں دوبار پھلتا ہے) وغیرہ وغیرہ۔اس ساری بحث میں صدیقی صاحب کا طریق کار ایک بردبار اور حلیم الطبع عالم کا ہے جو بغیر کسی جھنجھلاہٹ یا خشونت کے بڑی نرمی لیکن کمال ثبات کے ساتھ دلیلوں پر دلیلیں دیے چلا جاتا ہے۔ان کے نزدیک اردو کے مجتہد فصیحوں نے نہایت بے تکلفی اور بے باکی سے فارسی اردو اجزا کو باہم ملایا ہے مثلاً سوداؔ نے برفاب، غرقاب کے وزن پر ''چھڑکاب''[۷] بنالیا۔صدیقی نے اسے سندِ ثقاہت عطا کردی۔

تاریخی لسانیات سے صدیقی صاحب کے لگاؤ کے شواہد ان کی تحریروں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ان کے مقالے ''ہندوستان بغیر واؤ کے صحیح ہے'' کے مطالعے سے یہ امر بڑی صراحت سے آئینہ ہو جاتا ہے کہ ''ہندوستان'' کے مقابلے میں ''ہندستان'' (بغیر واؤ) کے زیادہ رائج رہا ہے۔ ایران کے متقدم شعرا ابوالفرج رونؔی، مسعود سعد سلمان، فرخؔی، عثمان مختاری، نظامؔی اور رومؔی وغیرہ سے لے کر متاخّر شعرا مثلاً جامؔی تک کے یہاں ''ہندستان'' ہی مستعمل رہا ہے۔ پھر فرہنگِ انجمن آرا ے جہانگیری میں رضا قلی خاں ہدایت نے ''ہندستان'' ہی کو مستقل لفظ کی حیثیت میں جگہ دی ہے۔ڈاکٹر صدیقی بے شمار مثالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ لفظ ''ہندستان'' کی وہی حیثیت ہے جو بغداد (باغِ داد)، پرستان (پری ستان)، دشمن (دشت من)، دشنام (دشت نام) اور ناخدا (ناوخدا) وغیرہ کی تھی۔ پھر معاملہ محض فارسی زبان تک نہیں رہا، عربی اور ترکی میں بھی 'ہندستان' بغیر واو کے مستعمل رہا ہے۔خود اردو شاعری میں وجہؔی، ولؔی، سوداؔ، میرؔ، آتشؔ، مصحفؔی، ناسخؔ، جرأتؔ، قدرؔ بلگرامی، اسمٰعیلؔ میرٹھی وغیرہ کے یہاں ''ہندستان'' ہی مستعمل رہا ہے۔میرے خیال میں بعض مستثنیات بھی ہیں جن کی طرف صدیقی صاحب نے اشارہ نہیں کیا مثلاً مصحفؔی کا یہ مشہور شعر کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے:

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی!

بہرحال صدیقی صاحب کے نزدیک فصحا کی زبان پر ''ہندستان'' اور ''ہندستانی'' ہی ہے اور یہی قابلِ ترجیح ہے۔ اس کے باوجود صدیقی صاحب ہندوستان اور ہندوستانی کو بھی غلط نہیں کہتے اور یہ ان کی سلامتیِ طبع کی دلیل ہے۔

اس مقالے میں ایک مقام پر صدیقی صاحب نے لکھا ہے کہ ''ہندستان'' کی مزید تخفیف ''ہندساں'' کی صورت میں بھی ملتی ہے۔ وہ اس ضمن میں فرہنگِ جہانگیری اور بہارِ عجم کی عبارتیں نقل کرتے ہیں جہاں ''ہندوستان'' کی ایک شکل ''ہندستاں'' نقل ہوئی ہے مگر وہاں فرّخی کا جو شعر درج ہوا ہے اس میں ''ہندستاں'' کے بجائے ''ہندساں'' ہے، شعر یہ ہے

گر ز جُودِ تو نسیمی بگذرد بر زنگبار!
ور ز خشم تو سمومی دروزد بر ہندساں

چونکہ دونو فرہنگوں کی نثری عبارت اور شعر میں مستعمل نظیروں (ہندستاں/ ہندساں) میں فرق ہے لہٰذا اب برہانِ قاطع سے سند لاتے ہیں جہاں لکھا ہے: ''ہندساں'' باسینِ بے نقطہ بروزنِ ہندواں''... پھر لکھتے ہیں کہ برہانِ قاطع کی اس تشریح سے جہانگیری اور بہار کی عبارتیں صاف ہوگئیں اور ''اب پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ استاد فرّخی کے شعر میں 'ہندساں' ہی ہے 'ہندستاں' نہیں۔ 'ہندساں' شاعروں کے کلام میں زیادہ نہیں ملتا مگر اس کا تو یقین ہوگیا کہ چوتھی صدی ہجری میں ''ہندساں'' زبان میں داخل ہو چکا تھا (مقالات صدیقی ص۴۱)۔ اس مختصر عبارت سے جہاں اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب لفظوں کے عہد بہ عہد متغیر اوضاع پر غیر معمولی نظر رکھتے تھے وہاں اس عبارت پر تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی: ''اب پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ استاد فرّخی کے شعر میں ''ہندساں'' ہی ہے 'ہندستاں' نہیں''۔ حیرت اس امر پر ہے کہ عروض اور معاملاتِ عروض پر گہری نظر رکھنے والے محقق کو یہ لکھنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ فرّخی کا شعر جس بحر میں (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات = رمل مثمن مقصور/ محذوف) ہے، اس میں 'ہندستاں' سما ہی نہیں سکتا۔ وہاں تو ''فاعلات'' کے وزن پر کوئی لفظ ہی آ سکتا تھا اور وہ ''ہندساں'' کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا، اس لیے بھی کہ زنگبار اور ہندساں میں رعایت معنوی ہے کہ دونوں میں ''سیاہی'' کا عنصر موجود ہے۔

اوپر ذکر ہوا کہ صدیقی لفظوں کے عہد بہ عہد متغیر اوضاع پر غیر معمولی نظر رکھتے تھے۔ اس کے

شواہد ان کے مقالات اور دیگر تحریروں میں جگہ جگہ ملتے ہیں مثلاً ''بغداد'' کی وجہ تسمیہ'' نامی معروف مضمون میں بغداد کے ایک توضیحی مترادف ''باغ داد''[۸] کے ضمن میں بتاتے ہیں کہ بعض کے خیال میں ''بغ'' کے معنی بستاں کے ہیں اور داد' عطا کیا۔ چونکہ کسریٰ (ساسانی بادشاہ) نے یہ باغ ایک خواجہ سرا کو دے دیا تھا لہٰذا ''بغ داد'' کہلایا۔ پھر داد تحقیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر یوں لیجیے تو پھر اس باغ کا نام 'باغِ دادہ' ہونا چاہیے تھا مگر 'دادہ' کی صورت ساسانی عہد کی زبان میں 'داذک' یا 'دازگ' تھی۔ یہ معرّب ہوکر (اگر پہلے الف کا حذف ہوجانا بھی مان لیا جائے تو) 'بغداذق' یا 'بغداذخ' ہوگیا ہوتا جیسے ''بَیذق'' اور ''ساذج'' اور موجودہ فارسی میں ''بغدادہ'' ہوتا مگر ان صورتوں میں سے ایک بھی نہیں ملتی۔[۹]

اسی مقالے میں آگے چل کر ''باغ داد'' یا ''باغِ داد'' کی تخئیلی اڑان کو رد کرتے ہوئے صدیقی بغداد کے پہلے حصے ''بغ'' کی معنویت اجاگر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس کی صورت اوِستا میں بَغَ اور بگَ، میخی کتبوں میں بَغَ' ہے اور اس کے معنی خدا/ دیوتا کے ہیں۔ ان کے خیال میں سنسکرت کے بھگوان یا بھگوت وغیرہ کا پہلا جز ''بھگ'' اور ''بَغ'' ایک ہی لفظ ہے۔ ایران میں یہ لفظ زردشتیت سے پہلے موجود تھا جب وہاں بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔ اسی طرح چند صفحات کے بعد صدیقی صاحب نے ''بے ستون'' کے ضمن میں تاریخی لسانیات کی روایت کو کام میں لاتے ہوئے جس گہرائی کے ساتھ اس کے اجزا کی مختلف وضعوں کی توضیح کی ہے، اس کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتی۔ بس، آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے، کی صورت ہے۔ مقالے کے آخر میں صدیقی صاحب نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ اسما و القاب کی کس طرح اپنی نہاد میں کسی عقیدے، ایقان یا اعتقاد کو چھپائے ہوتے ہیں جن تک نگاہ گہرے لسانی تاریخی شعور کے بغیر نہیں پہنچ پاتی۔ فغفور (بغپور) فَغ = خدا، دیوتا، پور = بیٹا، کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخی اور تقابلی لسانیات بہت سے قدیم مذہبی و معتقداتی تصورات کی بھی پردہ کشا ہے۔ لکھتے ہیں:

''بغپور'' چین کے شہزادوں کا لقب ہرگز نہ تھا... چین کے بادشاہ کو کہتے تھے اور اسے ویسا ہی استعارہ سمجھنا چاہیے جیسا ''ظل اللہ'' میں ہے۔ بادشاہ کے ربّانی حقوق کو پورب ہی نہیں پچھّم کی قومیں بھی آج سے چند ہی صدی پہلے تک مانتی رہی تھیں۔ خوارزمی کا خیال ادھر نہیں گیا، نہیں تو یہ فقرہ مفاتیح العلوم میں جگہ نہ پاتا: وَلَعَلّ بغدادُ ھی عَطِیّة الملِك (اور شاید

بغداد سے مراد ہو: بادشاہ کا عطیہ)۔[10]

دراصل لسانیات کی باقاعدہ سالہا سال کی تحصیل، ایک مدت کے تعمق اور مشرقی زبانوں اور ان کے ادبیات کے ساتھ گہری فکری و ذہنی وابستگی نے صدیقی صاحب کو غیر معمولی لسانی بصیرت عطا کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سطحی لسانی یا صوتی تماثلات کو بے اصولی گردانتے تھے۔ ان کا بالکل صحیح موقف تھا کہ لسانیات کی حالت اور حیثیت ریاضیات کی سی ہے۔ مختار الدین احمد کے نام اپنے ایک خط میں نہایت پتے کی باتیں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چند آوازوں اور ان کے مجموعوں (لفظوں) کو جان لینا اور بغیر کسی ترتیب اور نظام کے لکھ دینا لسانیات سے بہت دور ہے۔ لسانیات ایک Accurate Science ہے۔
>
> ۲۔ لسانی بحث کے لیے نہایت ضروری ہے کہ آپ لفظوں کی تاریخ معلوم کریں اور ہر قدم پر یہ دیکھیں کہ میں کچھ تاریخ کے خلاف تو نہیں کہہ رہا ہوں۔[11]

یہ فہمائش صدیقی صاحب کو اس لیے کرنا پڑی تھی کہ مختار الدین احمد نے اپنے ایک مضمون میں بعض انگریزی اور عربی لفظوں کی مماثلت دکھائی تھی۔ انھوں نے نہ صرف Navel کو ناف سے جا ملایا تھا بلکہ ناف کو عربی قرار دے ڈالا تھا۔ چنانچہ صدیقی صاحب کو وضاحت کرنا پڑی کہ ''ناف'' عربی نہیں فارسی ہے۔ عربی میں اسے ''سرۃ'' کہتے ہیں۔ انھوں نے اس طرح کی بے جوڑ لسانی مماثلتوں کو ''انتقال'' اور ''انت کال'' کی سی لسانی بوالعجبی قرار دیا تھا۔ ان کے خیال میں آریائی اور سامی زبانوں کو آپس میں جوڑنا سعیِ لاحاصل ہے۔ دلچسپ اور اہم بات یہ ہے کہ صدیقی صاحب کے اس موقف کی تائید ان کے سینئر معاصر احمد دین کی سرگذشتِ الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ احمد دین کی مذکورہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ احمد دین نے لکھا تھا:

> انتقال عربی الاصل ہے، نقل سے مشتق ہے۔ اسے سنسکرت انتسا[12] (موت) اور کال (وقت) سے ملانا بے جوڑ بات ہے۔ اسی طرح ''انتہا'' بھی عربی ہے، سنسکرت ''ان تھاہ'' یعنی جس کی تھاہ نہ ملے، بیان کرنا سراسر غلطی ہے۔[13]

لسانیات ہی کے ضمن میں عبدالستار صدیقی کا ایک قابلِ قدر مقالہ "Ibn Duraid and His Treatment of Loan Words" ہے۔ اس مقالے میں صدیقی صاحب نے عربی لسانیات کے دبستان بصرہ کے آخری سب سے بڑے عالم پر ایک مفصل مقالہ لکھا تھا۔ ابنِ درید نے بچانوے چھیانوے برس عمر پائی اور اب اس کی ولادت پر ۱۱۷۵ برس ہو چکے۔ اس کی ضخیم تصنیف جمہرۃ اللغہ ہے۔ ابنِ درید خلیج فارس اور ایران میں ایک مدّت تک مقیم رہا۔ دلچسپ بات ہے کہ وہ عالموں میں شاعر اور شاعروں میں عالم مشہور تھا۔ ابنِ درید نے عربی میں مستعار الفاظ کی نشان دہی وسیع پیمانے پر کی تھی۔ جوالیقی نے اپنی معرّب میں ابنِ درید سے جا بجا استفادہ کیا تھا بالکل اسی طرح جیسے خود ابنِ درید نے الخلیل کی کتاب العین سے فیض اٹھایا تھا۔ ابنِ درید نے اپنی کتاب میں کتاب العین سے فیض اندوزی کا اعتراف بھی کیا ہے اور اپنی تالیف میں برتے گئے طریق کار کی وضاحت بھی کی ہے۔ ابنِ درید نے عربی حروف تہجی اور ان کی اصوات پر بھی بصیرت افروز بحث کی ہے۔

یہاں اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ جس زمانے میں عبدالستار صدیقی گوءٹنگن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہے تھے، اپنے تحقیقی مقالے کی تکمیل تک ابنِ درید کی جمہرۃ اللغہ کا ضخیم مخطوطہ نہ دیکھ پائے تھے تاہم اس کے باوجود ابنِ سیدہ کی مخصّص اور جوالیقی کی معرّب کے مطالعے سے وہ اس صحیح نتیجے تک پہنچ گئے تھے کہ یہ ابنِ درید ہی تھا جس نے عربی میں مستعار الفاظ کی بڑی تعداد میں نشان دہی کی تھی۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کے شائع ہونے کے بعد جب صدیقی صاحب کو ہالینڈ کی لائیڈن لائبریری میں ابنِ درید کی ضخیم لغات جمہرۃ اللغہ کو دیکھنے کا موقع ملا تو ان کا سابقہ قیاس بالکل درست نکلا۔

ابنِ درید کمال درجے کی مجتہدانہ بصیرت کا حامل تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ متعدد مقامات پر اپنے نامور پیشرووں مثلاً الخلیل، سیبویہ، الاصمعی اور ابوعبیدہ کی تعبیرات سے اختلاف رکھتا تھا۔ صدیقی لکھتے ہیں کہ ''سجلّاط'' کے باب میں ابنِ درید، الاصمعی کے اس خیال سے متفق نہیں تھا کہ یہ لفظ فارسی سے مستعار ہے۔ اس کے تجسس نے اسے مجبور کیا اور اس نے ایک یونانی خاتون کو مذکورہ لفظ (سجلّاط دراصل ایک طرح کا کپڑا تھا) کی تفصیل بتا کر اس سے پوچھا کہ اسے یونانی (بازنطینی) کس نام سے پکارتے ہیں۔ خاتون نے جواباً کہا: سجلّاطس (Sigillatus)۔ ابنِ درید کی وسعتِ نظر اور لسانی تگ و تاز کا ذکر کرتے ہوئے صدیقی لکھتے ہیں:

> He not only tries to sort out provincial and dialectical words and indicates the localities where they were in use originally, but also distinguishes sharply between the varions dialects of Arabic on one hand and the other semitic languages on the other, and it is only in respect of words from the latter, or, of course, from non-semitic languages that he uses the term مــعــرّب "Arabicized". A number of his statements show that Ibn Duraid had a clear idea as to from what sources and in what way loan-words came into Arabic.[۱۴]

صدیقی صاحب چونکہ خود ممتاز اور صاحب نظر محقق ہیں لہٰذا اُنھوں نے ابنِ درید کی غیر معمولی لسانی بصیرت کے اعتراف کے باوجود لکھا ہے کہ عربی میں مستعار الفاظ کے باب میں بعض صورتوں میں اس سے اتفاق کرنا ممکن نہیں تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا طریقِ کار درست تھا۔ مقالے کے اخیر میں صدیقی صاحب نے ابنِ درید کی کتاب کی تیسری جلد کا وہ باب نقل کیا ہے جس میں مستعار الفاظ سے بحث کی گئی ہے اور وہ اقتباسات درج کیے ہیں جو مستعار الفاظ سے متعلق ہیں اور پوری کتاب میں جابجا موجود ہیں۔

یہ بات معلوم ہے کہ تاریخی لسانیات کی مقتضیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس منہاج سے استفادہ کرنے والے کی عہد بہ عہد تاریخ اور جغرافیہ اور دیگر متعلقات پر بھی کافی ووافی نظر ہونی چاہیے۔ صدیقی ان تقاضوں سے خوب آگاہ تھے چنانچہ ان کی تحریروں سے جابجا تاریخی اور جغرافیائی معلومات پھوٹی پڑتی ہیں۔ وہ 'بغداذ' کے نام کے پہلے حصے ''بغ'' کا ذکر کرتے ہوئے نہیں بھولتے کہ اور بھی کئی قریے ایسے ہیں جن کا سابق 'بغ' ہے مثلاً ہرات اور مَرُو کے درمیان ایک قصبہ بَغشُور (جسے صرف بَغ بھی کہتے ہیں)، ارمینیا میں ایک بغاوَند، ایک بَغرَ وند۔ یہ اور اس طرح کے دیگر متعدد پیش کردہ نظائر سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب لسانیات کے بین العلومی منہاج سے خوب واقف تھے۔ وہ عہدِ وسطیٰ کے مسلم مورخین وادبا مسعودی، احمد ابن یحییٰ بلاذری، البیرونی اور یاقوت حموی وغیرہ کے علمی آثار سے استفادہ کرکے اپنی لسانی تحقیقات کو استوار کرتے تھے۔

ابھی اوپر دبستانِ بصرہ کے نامور عالم ابنِ درید کی جمهرة اللغه اور اس کے ان مباحث کا ذکر ہوا جو معرّبات سے متعلق تھے۔ خود معرّبات سے صدیقی صاحب کی دلچسپی قرار نا آشنا تھی اور اگر یہ کہا جائے کہ آخر وقت تک رہی تو غلط نہ ہوگا۔ ''معرّب لفظوں میں حرفِ ''ق'' کی حیثیت'' انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصے

(۱۹۶۱ء) میں لکھا اور یہاں بھی تاریخی اور تقابلی تحقیق کا حق ادا کردیا مثلاً اس مقالے کے آغاز ہی میں انھوں نے اپنے وسیع لسانی مطالعے کا ثبوت دیتے ہوئے لکھا کہ ''ق'' جس آواز کی نیابت کرتا ہے وہ تمام سامی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ آریائی زبانیں اس حرف سے خالی ہیں تاہم ترکی اس سے مستثنیٰ ہے کہ غیر سامی ہونے کے باوجود اس میں ''ق'' کی صَوت موجود ہے (واضح رہے کہ ترکی بقول صدیقی نہ سامی زبان ہے نہ آریائی بلکہ تاتاری ہے)۔ اس مقالے سے اس دلچسپ حقیقت کا بھی پتا چلا کہ بعض اوقات کسی زبان کے متغیر ہوجانے والے لفظوں اور آوازوں کی محافظت ان کی اصل صورت میں کسی اور علاقے یا جغرافیائی خطّے کی زبان بھی کرتی ہے جیسے مثلاً ارمنی زبان میں فارسی لفظوں کی پرانی شکلیں محفوظ ہیں۔ ارمنی ایرانی زبان نہیں بلکہ اس علاقے کی زبان ہے جو ایران کے شمال مغرب میں آذربائیجان سے ملحق ہے۔ صدیقی لکھتے ہیں:

> فارسی زبان کے محققوں کو ارمنی سے بہت مدد ملی اور بہت سی کھوئی ہوئی کڑیاں مل گئیں چنانچہ جن لفظوں میں 'ک' یا 'گ' باقی نہیں رہا تھا ارمنی سے اس کا وجود یقینی ہوگیا۔ جو 'ک' سامی زبانوں میں 'ق' ہوگیا ہے وہ ارمنی میں 'ک' ہے اور جس 'گ' نے سامی میں 'ج' کا تلفظ اختیار کیا، ارمنی میں وہ اب بھی 'گ' ہے۔[۱۵]

''معرّبات'' سے اسی غیر معمولی لگاؤ کے پیشِ نظر صدیقی صاحب نے معرّباتِ عبدالرشید تتوی (م۔ ۱۰۷۷ھ) کا ایک قلمی نسخہ رام پور اسٹیٹ لائبریری سے ڈھونڈ نکالا۔ حیدرآباد دکن والا نسخہ ان کا اپنا مملوکہ تھا۔ انھوں نے اس کی ترتیب کا کام بقول ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی بیسویں صدی کے چھٹے عشرے کی ابتداء میں شروع کردیا تھا (رسالہ معرّباتِ رشیدی، کراچی، ص ۷)۔

معرّباتِ رشیدی کی تدوینِ نو (۲۰۰۳ء، مرتّبِ ثانی: ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی) کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ مرحوم صدیقی صاحب نے معرّباتِ رشیدی کو نسخۂ حیدرآباد (جو ان کا ذاتی نسخہ تھا اور ۱۹۲۱ء میں اپنے قیام حیدرآباد کے زمانے میں انھیں ملا تھا) اور نسخۂ اسٹیٹ لائبریری رامپور کے تقابل کے بعد مدوّن کیا تھا۔ موخر الذکر نسخہ انھیں ۱۹۴۶ء میں ملا تھا۔ انھوں نے اپنے حیدرآبادی نسخے کو اساسی نسخہ قرار دیا تھا مگر اسے بھی محققانہ ژرف نگاہی سے جانچا اور آنکا تھا۔ ڈاکٹر شیرانی لکھتے ہیں:

> انھوں نے نسخۂ ب (حیدرآبادی نسخہ) کو اساسی نسخہ قرار دیا لیکن آنکھیں بند کرکے اس پر اعتماد

> نہیں کیا۔ چنانچہ پاورقی (کذا) میں دونوں نسخوں کے متن کا فرق دکھایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مختصر حواشی اور بعض کتابوں کے حوالے بھی درج کیے گئے ہیں۔ رسالہ ہٰذا کی تشریحی زبان فارسی ہے اس لیے مرتب نے حواشی بھی فارسی میں دیے ہیں۔ صرف ۲۹ صفحہ پر معجم البلدان کا ایک مختصر اقتباس عربی میں ہے۔[16]

معرّباتِ رشیدی ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں وہ انگریزی دیباچہ شامل نہیں جو لکھا تو گیا مگر صدیقی صاحب کی غیر معمولی مثالیت پسندی کے باعث خود ان کے لیے موجبِ اطمینان نہیں رہا تھا۔ اس کے کم و بیش دو برس بعد آقاے محمد عباسی نے تہران سے فرہنگِ رشیدی شائع کر دی جس کے دوسرے حصے کے آخر میں انھوں نے اضافہ شدہ رسالہ معرّبات رشیدی بھی شامل کر دیا جو انھیں مخطوطے کی صورت میں دستیاب ہوا تھا۔ نسخۂ تہران کی اس اشاعت کے باعث صدیقی صاحب کو اپنے مطبوعہ نسخے پر نظرِ ثانی کرنا پڑی چنانچہ انھوں نے اپنے نسخے پر نسخۂ تہران کی روشنی میں کچھ حواشی لکھے لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات اور گرتی ہوئی صحت کے باعث وہ اُس نسخے کا اپنے نسخوں سے متنی تقابل کرنے کا حق ادا نہ کر پائے۔ یہ کام مرحوم مشفق خواجہ کے ایما پر جناب مظہر محمود شیرانی نے کیا اور حق یہ ہے کہ ان کی مساعی سے معرّباتِ رشیدی کی ایک اطمینان بخش تدوین اہلِ علم کے ہاتھ آئی۔ شیرانی صاحب نے صدیقی صاحب کے انگریزی دیباچے کا اردو ترجمہ بھی اپنی تدوین میں شامل کیا اور مرحوم کے جملہ حواشی بھی اپنے حاشیوں کے اضافے کے ساتھ شامل تدوین کیے۔

معرّباتِ رشیدی مرتبہ عبدالستار صدیقی کے مختصات کیا ہیں اور انھوں نے مؤلف عبدالرشید تتوی کے حالات اور اس کے علمی کارناموں کی تفصیل کے ضمن میں کیا لکھا اور اس پر مرتب ثانی نے کیا کیا اضافے کیے اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں مگر اتنی بات اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ مرتب ثانی کی غیر معمولی تحقیقی کاوش جتنی بھی قابلِ داد سہی اس کی بنیاد گزاری بہر حال عبدالستار صدیقی ہی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔

لفظ و لسان سے ڈاکٹر صدیقی کے عشق و انسلاک کے متعدد مظاہر ان کی اور بہت سی تحریروں میں بھی بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مختلف فرہنگوں کے صحت و سقم پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور یہ گہری نظر دراصل متعدد زبانوں کے عمیق مطالعے کا حاصل تھی۔ ''ہندستان بغیر واو کے صحیح ہے'' نامی مقالے میں، جس سے پہلے بھی استشہاد کیا جا چکا ہے، ایک جگہ تین بڑی اہم فارسی فرہنگوں فرہنگِ جہانگیری، برہانِ قاطع اور

بہار عجم کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ انھیں مستند مانتے ہیں مگر ان کے بعض مشمولات کو قابلِ اصلاح سمجھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> فرہنگ جہانگیری کی فروگذاشتوں کی تلافی کی غرض سے فرہنگِ رشیدی تصنیف ہوئی۔ برہان قاطع پر غالبؔ نے اعتراضوں بلکہ خوردہ گیریوں کی بوچھار کی۔ کتنے جواب اور جواب الجواب لکھے گئے... ناصرالدین شاہ قاچار کے عہد میں رضا قلی خاں ہدایتؔ (صاحبِ تذکرۂ مجمع الفصحا) نے یہ کوشش کی کہ ٹکسالی فارسی کا ایک لغت ترتیب دے۔ اسی کوشش کا نتیجہ ہے فرہنگِ انجمن آراے ناصری۔ کتاب کے طویل مقدمے میں مصنف نے اپنے پیشرو لغت نویسوں کی غلطیاں چُن چُن کر گنائی ہیں اور فرہنگ کے متن میں بھی جا بجا اَوروں کی لغزشوں کا ذکر کیا ہے۔ رضا قلی خاں کی کتاب اس لحاظ سے زیادہ مستند خیال کی جاتی ہے کہ اس کے پیشِ نظر متقدمین، متوسّطین اور متاخّرین کی تصنیفوں کا بیش قرار ذخیرہ تھا اور اس نے ایران میں بیٹھ کر فارسی کا لغت لکھا جو اس کی زندگی ہی میں چھپ بھی گیا۔[17]

جس زمانے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نوادرالالفاظ (آرزوؔ) کی تدوین کر رہے تھے، ڈاکٹر صدیقی نے جس اخلاص اور جانکاہی سے سید صاحب کی رہنمائی کی اس کی تفصیل خود سید عبداللہ نے نوادرالمکاتیب کی تمہید میں فراہم کر دی ہے۔ نوادرالالفاظ کے متنازع فیہ الفاظ کی ترتیب دادہ فہرست کے اُن الفاظ کے تلفظ اور ان کے متروک اور مروّج معانی کی صدیقی صاحب نے غیر معمولی تحقیق کی اور اس ضمن میں متعدد پیشہ وروں سے مل کر ان الفاظ کی گرہیں کھولیں۔ نوادرالالفاظ کے مقدمے میں سید عبداللہ کے اس اعتراف میں کوئی مبالغہ نہیں سمجھنا چاہیے جب انھوں نے لکھا کہ عبدالستار صدیقی (اور عرشی) کی مراسلتیں اگر شائع کر دی جائیں تو اہلِ علم کے لیے یہ مراسلتیں بجاے خود غرائب اللغات اور نوادرالالفاظ بن جائیں۔ بعد ازاں جب سید صاحب نے نوادرالمکاتیب کے زیرِ عنوان ان خطوں کا ایک حصہ اردو نامہ، کراچی میں شائع کر دیا تو واقعی ان کے مذکورہ قول کی تصدیق ہو گئی۔ صرف چند ایسے مقامات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ کباب کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ بڑی قسمیں دو ہیں۔ ایک وہ جو سیخ پر بھونے جاتے ہیں یعنی

قیمے کومہین پیس کراور نمک اور مسالہ لگا کر سیخ پر لپیٹ دیتے ہیں اور پھر سیخ کو آگ دکھاتے جاتے ہیں اور پھریری سے تھوڑا تھوڑا گھی چپڑتے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کڑھائی میں ڈال کر تلے جاتے ہیں یعنی شامی کباب، شکم پر کباب وغیرہ۔اس دوسری قسم کے کباب کو الٹنے کے لیے ایک آلہ استعمال ہوتا ہے جس کی شکل ارّے کی سی ہوتی ہے۔فرق صرف یہ کہ ڈنڈی چھوٹی ہوتی ہے۔شکل کی مناسبت سے قرینِ قیاس ہے کہ اسے بھی اس زمانے میں ارّا کہتے ہوں (اور فارسی کتابت کے اثر سے ''ارّہ'' لکھتے ہوں)۔[18]

۲۔ میں نے لکھنؤ سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہاں کے نانبائی تنور میں سے روٹی نکالنے کے دونوں آلوں کو جو ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں ''جوڑی'' کہتے ہیں۔ وہ سیخ جس کا ایک سرا چپٹا (کھرپی کی شکل کا) ہوتا ہے ''ارّا'' کہلاتی ہے اور دوسری سیخ جس (کی) نوک مڑی ہوئی ہوتی ہے ''طوطا'' (یعنی توتا) کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ یہ تو نانبائیوں کی اصطلاحیں ہوئیں۔ بسکٹ بنانے والوں سے دریافت کیا گیا۔ میرا پرچہ نویس لکھتا ہے کہ بسکٹ والوں کے ہاں ایک آلہ ہے جسے ''ارا'' (بلا تشدید) کہتے ہیں مگر اس آلے سے جلانے کی لکڑی تنور میں ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے بسکٹ پکانے والوں کی اصطلاحیں مستحدث ہوں گی۔ اصل وہی نانبائیوں کی اصطلاحیں ہیں۔[19]

۳۔ ''پٹا دینا''۔ اس زمانے میں ''پٹی دینا'' ورغلانے یا دھوکا دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اگلے زمانے میں ''پٹّا'' ہوگا۔ لفظ وہی ہے۔ ''پٹی پڑھانا'' بھی بولتے ہیں۔[20]

۴۔ ''پھرت''، وہ چیز جو پھر دی جائے۔ زرِ ناسرہ بھی صرّاف پھیر دیتا ہے، قبول نہیں کرتا۔[21]

۵۔ ''پتا دیولی''، اسی طرح لکھا ہے۔ اس کے دو مرادف (فارسی) لکھے ہیں ایک پرِستُوک (اور پرِستُو اور پرِستُک) دوسرا بادخورک۔ اصل عبارت یہاں نقل کرتا ہوں:

''پتا دیولی مرغکِ سیاہ کہ پیوستہ در پرواز باشد و آنرا پاپیل (کذا) نیز گویند بادخورک بباءِ موحدہ و پرستوک و پرستو و پرستک ہر سہ ببای فارسی و سینِ مہملہ و (ضمِ) فوقانی''

''پاپیل'' ظاہرا ''ابابیل'' کی تصحیف ہے۔ عربی لفظ ابابیل کو ہندستانیوں نے غلط طور پر ایک خاص پرندہ سمجھا اور اردو میں پرستوک (=وطواط = Swallow) کو ابابیل کہنے لگے۔

بادخورک وہ سیاہ پرندہ ہے جو ہوا میں رہتا ہے اور ہوا ہی اس کی خورش ہے۔ فارسی فرہنگ نویسوں نے اکثر پرستوک اور بادخورک کو ایک جانا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادخورک ایک افسانوی پرندہ ہے اور اسی لیے بعضے فرہنگ نگاروں نے اسے 'ہما' کا مرادف قرار دیا ہے۔[22]

اوپر کے اقتباسات سے بہ آسانی اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صدیقی لفظ و لغت کے کھوج میں کتنا لمبا سفر کرنے کے قائل تھے۔ ''پتا دیولی'' کی تشریح میں وہ فارسی فرہنگوں سے استشہاد کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کم و بیش سارے ہی فارسی فرہنگ نویس پرستوک/ پرستو اور بادخورک/ بادخور کو ایک جانتے ہیں تاہم یہ معلوم نہیں ہو پایا کہ کون سے فرہنگ نگاروں نے بادخورک کو 'ہما' کا مرادف قرار دیا ہے۔ برہانِ قاطع، غیاث اللغات، فرہنگِ معین اور لغت نامۂ دھخدا، سے لے کر فرہنگِ عمید اور تازہ ترین قابلِ قدر فرہنگ یعنی فرہنگ بزرگِ سخن (دکتر حسن انوری) تک دیکھ جایئے پرستو/ پرستوک/ بادخورک کے حوالے سے متعدد حیران کن تفصیلات ملیں گی مگر کہیں یہ نظر نہ آئے گا کہ بادخورک 'ھما' کے مترادف ہے۔ لغت نامۂ دھخدا تو دراصل تمام اہم لغات کا جامع ہے مگر اس میں بھی مذکورہ حوالہ نہ مل پایا۔ علاوہ ازیں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ پرستو/ پرستوک میں 'پ' اور 'ر' کو لغت نویسوں نے کسرہ اور فتحہ دونوں سے لکھا ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر چند اہم فرہنگوں سے مذکورہ الفاظ کے معانی درج کر دیے جائیں:

ا۔ بادخورک: مرغکی است سیاہ و کوچک و او پیوسہ در پروازمی باشد، گویند غذای او باد است و اگر درجای نشیند دیگر نتواند برخاست و بعضی گویند ابابیل ھمان است''۔ برہانِ قاطع، ص ۱۴۴۔

۲۔ پرستو: بکسرِ اول و ثانی و سکون ثالث و ضمِ فوقانی و واوِ ساکن۔ بمعنی پرستک است کہ خطّاف باشد و بعضی گویند پرستو وطواط است کہ آن خطافِ کوھی باشد''__ برہانِ قاطع، ص ۲۴۸۔

اسی لغت میں پرستو کے بعد پرستوک کے تحت اوپر کے معانی درج کرنے کے بعد اس پرندے کے بارے میں کچھ محیرّ العقول باتیں لکھی ہیں جنھیں اُسطور کا درجہ دیا جا سکتا ہے مثلاً لکھا ہے کہ جب چاند بڑھ رہا ہو اور پرستو کے پہلے بچے کو پکڑ کر اس کا پیٹ چاک کریں تو اس میں سے دو سنگریزے نکلیں گے۔ ایک تو یک رنگ اور دوسرا رنگا رنگ۔ جب اسے (یا انھیں) بچھڑے یا پہاڑی بکرے کی کھال میں لپیٹ کر (اس پر گرد و غبار

پڑنے سے پہلے) کسی مصروع (مرگی کے دورے میں مبتلا) کے بازو پر باندھ دیں یا اس کی گردن میں حمائل کردیں تو مرگی کا مرض جاتا رہے گا اور کہتے ہیں کہ اگر دو ابابیلیں (پرستوک) ایک نر ایک مادہ پکڑ کر ان کے سر آگ میں جلا کر شراب میں ڈال دیں تو جو بھی وہ شراب پیے گا ہر گز مست نہ ہوگا اور اگر اس کا خون عورتوں کی خوراک میں شامل کر کے انھیں کھلا دیا جائے تو ان کی شہوت جاتی رہے گی... وغیرہ وغیرہ۔ ص ۲۴۸

۳۔ پرستوُ/پرِستُگ: طائریست کوچک وسیاہ کہ در سقف وعمارات پختہ (؟) از پرہا آشیانہ سازدو باسمِ ابابیل شہرت دارد' غیاث اللغات، ص ۱۶۸ (بحوالۂ برہان و جہانگیری)

۴۔ بادخورک کی وضاحت میں لغت نامہ دھخدا میں لکھا ہے کہ اس کا ایک نام زازال بھی ہے (بحوالۂ ناظم الاطبا، ص ۲۲۴)۔ ایک مترادف بادخوار بھی دیا ہے اور دوسرا پرستو۔

پرستو کی وضاحت میں دھخدا میں وہ طویل عبارت لفظاً لفظاً درج کر دی گئی ہے جو برہان میں ہے اور پھر جہانگیری سے دو شعر بھی نقل کیے ہیں جن میں دوسرے کا مفہوم برہان نے بھی بیان کیا ہے۔ شعر یہ ہیں:

از پرستوک اگر خوری لحمش
دیدہ را روشنی کند (شود؟) حاصل
خون اورا، چوزن بیاشامد
شہوتِ زن ہمہ کند زایل

ص ۲۱۴۔

۵۔ پرستو: فرہنگِ معین میں اس کے کئی قدیم مترادف بھی دیے ہیں یعنی پرستوک، پرستک، فرستک، فراستوک، فراشتوک فراشتر، فراشتروک۔ ان کے علاوہ دیگر مترادفات میں چلچلہ، زازال، ابابیل، بلوایہ، پیلوایہ اور خطاف بھی گنوائے گئے ہیں، جلد اول، ص ۷۴۱۔

واضح رہے کہ فرہنگ معین میں بادخورک کو پرستو کے مرادف یا مترادف قرار نہیں دیا گیا۔

۶۔ فرہنگِ عمید میں پرستو کے کچھ اور مترادفات مثلاً فرشتوک، بلسک، بالوایہ، بالوانہ، پالوانہ، پیلوانہ، دالیوزا اور باسیچ بھی دیے گئے ہیں ___ فرہنگ عمید جلد اول، ص ۴۵۱۔

اس قدر تفصیل میں جانے اور قارئین کی ''چشم خراشی'' پر معذرت!

لفظ و فرہنگ سے ڈاکٹر صدیقی کی وسیع دلچسپی کے ذیل میں دو اقتباسات مزید ملاحظہ فرمائیے:

ا۔ ابھی تک اتنی فرصت نہیں ملی کہ انشا کی ترکی کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کروں۔ وہ جو ملاّحوں کی بولی کی نقل اتاری ہے وہ بنگال کے ملاحوں کی نقل ہے۔ بنگالی زبان کی بہت ہی عام چیز یہ ہے کہ آپ کا ہر فتحہ ان کے ہاں ضمّہ ہو جاتا ہے اور اکثر کسی قدر اِشباع کے ساتھ اور کبھی پورا او ہو کر ان کی زبان سے نکلتا ہے جیسے گھر کو گھور اور گنگا کو گونگا کہتے ہیں۔ انشا پیدا ہی بنگال میں ہوئے تھے۔ ملاحی کا پیشہ کرنے والے بنگال میں مسلمان ہی ہیں اس لیے یہ بہت قرینِ قیاس ہے کہ بنگال کے ملاح مراد ہیں۔[۲۳]

ب۔ کھانے سب تو نہیں جو سامنے تھے ہو چکے۔ ایک لذیذ چیز رہ گئی۔ اودھ کے قصبوں میں ''جھجلے'' پکتے ہیں اور اودھ ہی میں کہیں کہیں ان کو ''شیرازے'' بھی کہتے ہیں۔ عربی میں پانی نچوڑے ہوئے دہی یا پنیر کو ''شیراز'' کہتے ہیں اور جمع دو طرح پر آتی ہے ''شراریز'' اور ''شواریز''۔ برہانِ قاطع میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس لفظ کو عربی بتایا ہے۔ عربی لغت کی کتابوں میں اسے فارسی بتایا ہے اور یہی صحیح ہے۔ فارسی میں علاوہ پنیر کے بعض مٹھائیوں، مربّے اور اچار کو بھی کہتے ہیں۔ ''جھجلے'' بھی میٹھی چیز ہے۔ معلوم نہیں ایران کی کس خاص مٹھائی کی مشابہت سے ''شیرازے'' نام پڑا۔[۲۴]

''جھجلے'' کی کچھ اور دلچسپ تفصیل صدیقی صاحب نے اپنے بہت معلومات افزا مضمون ''کچھ بکھرے ہوئے ورق'' مشمولہ ہندستانی میں بھی دی ہے۔ یہ تفصیل لطیف احمد عثمانی بلگرامی کی مختصر سوانح کے ذیل میں دی گئی ہے جو غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ صدیقی لکھتے ہیں:

ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ لطیف ایک بار اپنے استاد (غالبؔ) سے ملنے دلی گئے تو ان کے لیے بلگرام سے ''جھجلے'' پکوا کر ساتھ لے گئے۔ غالبؔ کو یہ مزیدار چیز ایسی پسند آئی کہ

سولہ سترہ شعرا اس کی تعریف میں کہہ ڈالے جن میں سے صرف ایک ہی اب لوگوں کو یاد رہ گیا ہے: خوشا لذتِ جھجلۂ بلگرام۔ کہ شبنم از و تازگی کرد وام[۲۵]

گمان ہے کہ ''جھجلے'' کی لذت کے اسیر غالبؔ ہی نہیں صدیقی صاحب بھی تھے۔ تبھی تو مذکورہ اقتباس کے حاشیے میں اس کے اجزائے ترکیبی اور اس کے بنانے کا طریقہ تک بیان کر دیا:

یہ لذیذ پکوان اودھ کے اکثر قصبات میں عام ہے۔ ماش کی دال کو سِل پر پیستے اور چھان پھینٹ کر اس کے چھوٹے چھوٹے گلگلے بناتے ہیں اور انھیں گھی میں تل کے قوام یا دودھ میں ڈال دیتے ہیں۔ بعض مقامات پر ان کو ''شیرازے'' اور کہیں ''نازکیاں'' بھی کہتے ہیں۔

(حاشیہ ہندستانی، ص۴۸۲)

کیا معلوم کہ جب میرؔ نے ذیل کا شعر کہا ہوگا تو اس میں ''نازکی'' کے لفظ میں شیرینیِ لب کے ساتھ ساتھ ''شیرازے'' کی شیرینی اور لذت بخشی کا ایہام بھی رکھا ہو (آخر عمر کا طویل حصہ اُنھوں نے اودھ ہی میں بسر کیا تھا):

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

قابلِ مبارک باد ہیں ڈاکٹر صدیقی جیسے زبان شناس جنھوں نے اردو کے کتنے ہی گم شدہ خوابیدہ الفاظ کو قم باذن اللہ کہہ کر جگایا اور ہماری تہذیبی توسیع کا سروسامان کیا! کیا ہم 'مشکل خواں'، 'چاشنی گیر' (نمونہ گیر) 'سوداور' (سوداگر)، 'ٹاٹ بافی'، 'میدہ سالار'، 'مائدہ سالار' (چاشنی گیر)، 'جھجلے' اور 'شیرازے' ایسے غیر معمولی الفاظ کو بھول نہیں گئے تھے؟

املا اور صحتِ املا کے باب میں بھی ڈاکٹر صدیقی کی کاوشیں قابلِ داد ہیں۔ صحتِ املا کے ضمن میں وہ ان اصحاب میں سے ہیں جن پر سابقون الاوّلون کی ترکیب کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ اس خیال کے زبردست علمبردار تھے کہ اردو املا کی معیار بندی ضروری ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہر معاشرے میں بڑا گروہ مقلدوں اور عادت کے بندوں کا ہوتا ہے اور تدارک یا اصلاح کی ذمہ داری اہلِ تحقیق پر عائد ہوتی ہے۔ وہ اس خیال کے مؤید تھے کہ اہلِ تحقیق املا کے لیے قواعد سازی کریں۔ اس ضمن میں انھوں نے جو نہایت اہم تجاویز پیش کیں وہ ان کے ایک قابلِ قدر مقالے ''اردو املا'' اور بعض دیگر تحریروں میں موجود ہیں۔ انھوں نے بجا طور پر اس امر پر

اصرار کیا کہ ہندی لفظ ہو تو اسے ہ کے بجائے الف پر ختم ہونا چاہیے سوائے مقاموں کے ناموں کے مثلاً پٹنہ، آگرہ وغیرہ۔ اسی طرح ان لفظوں کے آخر میں بھی الف لکھا جانا چاہیے جو ایک اردو اور ایک فارسی یا عربی جُز سے بنے ہوں جیسے تماہا، پچرنگا، وغیرہ۔ وہ اسم جو اِفتِعال یا استفعال کے وزن پر مصدر ہیں اور ان کے آخر میں الف کے بعد ہمزہ ہے، یہ فارسی اور اردو میں گر جاتا ہے اور ایسے لفظوں کو مندرجہ ذیل صورت میں لکھا جانا چاہیے: ابتدا، ارتقا، اِقتدا، اِستِقرا، استقصا وغیرہ۔

صحت املا کے ضمن میں ڈاکٹر صدیقی کی ایک اور اہم تجویز یہ تھی کہ مختفی ہ پر ختم ہونے والے مذکر اسم جب واحد محرف حالت میں ہوں تب بھی ان کا تلفظ وہی ہوتا ہے جو جمع قائم کی حالت میں ہوتا ہے ایسی صورت میں ''میں مدرسہ جاتا ہوں''، ''شیر کے پنجہ میں بڑی طاقت ہوتی ہے'' کے بجائے یوں لکھنا قرینِ صحت ہوگا: ''میں مدرسے جاتا ہوں''، ''شیر کے پنجے میں بڑی طاقت ہوتی ہے'' وغیرہ۔

ہمزے کے سلسلے میں صدیقی صاحب کا موقف یہ تھا اور بالکل درست تھا کہ اردو میں ہمزہ الف کا قائم مقام ہے لہٰذا جب دو حروفِ علت اپنی الگ الگ آواز دیں تو ان کے درمیان ہمزہ آتا ہے جیسے آءو، جاءو، گاءو، مگر بھاوتاو، کھاو، کڑھاو میں ہمزہ غیر ضروری ہے۔ اسی طرح لیے، دیے، کیے میں بھی ہمزہ غیر ضروری ہے۔ صدیقی صاحب تمام عمر اپنی تحریروں میں الگ الگ آواز دینے والے دو حروفِ علت کے درمیان ہمزہ لکھتے رہے جیسے تم آءو تو آم لیتے آءو، وغیرہ مگر اردو دنیا نے ان کے اس صحیح موقف کو قابلِ قبول نہ سمجھا اور ہمزے کو ہمیشہ و کے اوپر علامت کے طور پر استعمال کیا یعنی تم آؤ تو آم لیتے آؤ۔ جب جاؤ مجھے بتا کر جاؤ وغیرہ۔

ہمزے ہی کے ضمن میں ان کا یہ قول بھی صحیح تھا کہ ایرانیوں کے یہاں ہمزہ بہت کم استعمال ہوتا ہے اور وہ معمولاً ہمزے کی جگہ ی استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ اردو زبان میں ہمزے کا چلن بہت ہے لہٰذا ایرانیوں کی پیروی کے بجائے عربی لفظوں کو جو اردو میں مستعمل ہوتے ہیں، ہمزے سے لکھنا چاہیے جیسے تائب، قائل، سائل، حقائق، خائن، شائع وغیرہ۔ ان کا یہ کہنا بھی اپنے اندر بڑا وزن اور صداقت رکھتا تھا کہ رائے، جائے، خدائے وغیرہ پر ہمزہ نہیں آنا چاہیے۔ علاوہ ازیں جب کسی لفظ کے آخر میں ہائے مختفی آئے اور وہ لفظ کسی دوسرے لفظ سے مل کر مرکب بنا رہا ہو تو ہائے مختفی پر ہمزہ لانا چاہیے نہ کہ کسرہ جیسے مثلاً درجۂ عالی، تودۂ خاک وغیرہ۔[۲۶]

رشید حسن خاں نے اپنی کتاب اُردو املا میں جا بجا عبدالستار صدیقی کی لسانی بالغ نظری اور اُردو املا کے باب میں ان کے مجتہدانہ مگر متوازن نقطۂ نظر کی توصیف کی ہے۔ ان کی اُردو املا پر جگہ جگہ صدیقی صاحب کا فیضان کارفرما نظر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اس کتاب کا انتساب بھی صدیقی صاحب ہی کے نام کیا۔ اُنھوں نے اس کتاب میں کئی مقامات پر عبدالستار صدیقی کی اُردو املا کی معیار بندی کے سلسلے کی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اس زمانے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم واحد شخص تھے جنھوں نے اس موضوع کا مستقل موضوع کی حیثیت سے مطالعہ کیا اور بار بار لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ رسالہ ہندستانی، رسالہ اردو، رسالہ معیار میں ان کے نہایت اہم مضامین محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف کتابوں کے تبصروں اور مقدموں میں بھی وہ ان مسائل کا بار بار ذکر کرتے رہے۔ ان میں مقدمۂ کلیاتِ ولیؔ، مقدمۂ خطوطِ غالبؔ (مرتّبہ منشی مہیش پرشاد) تبصرۂ مکاتیبِ غالبؔ (مرتّبہ عرشی...) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے خطوں میں انھوں نے املا کے مسائل و اغلاط کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا[۲۷]... انجمن ترقیِ اُردو نے اصلاحِ املا کی تجاویز کو جس انداز سے مرتب کیا تھا... اور جس طرح اس موضوع کو اہمیت دی تھی، اس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کاوشوں کو بہت زیادہ دخل تھا۔[۲۸]

یہ وہ زمانہ تھا جب اردو املا کے سلسلے میں بعض نہایت مضحکہ خیز تجاویز (مثلاً یہ کہ اردو میں ایک آواز کے لیے ایک ہی حرف ہونا چاہیے، س، ث، ص ان تین حرفوں میں سے س کو باقی رکھا جائے وغیرہ وغیرہ) انقلابی تجاویز کے طور پر سامنے لائی جا رہی تھیں۔ رشید حسن خاں اعتراف کرتے ہیں ایک زمانے میں وہ خود ان تجاویز کے پھیر میں آ چکے تھے مگر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی ''فہمائش اور تعلیم نے اُس 'جہادِ کم نظری' کے پیچ و خم سے نجات دلائی'' (اردو املا، ص۲۹)۔ خان صاحب نے صدیقی صاحب کو املا کے موضوع پر ''استادِ کل'' قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو املا کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ان سے کچھ پہلے احسنؔ مارہروی کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ البتہ اُردو دنیا کی بدقسمتی ہے کہ املا کے سلسلے میں وہ اب تک دو عملی کا شکار ہے۔

یہ بات معلوم ہے کہ ڈاکٹر صدیقی بنیادی طور پر عربی زبان و ادب کے آدمی تھے۔ عربی زبان و

لسانیات سے انسلاک کے باوجود وہ اردو زبان و ادب سے بھی اٹوٹ وابستگی رکھتے تھے اور اردو زبان کے الگ اور منفرد تشخص کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس پر اصرار بھی کرتے تھے۔ اس ضمن میں منجملہ اور موارد کے وحیدالدین سلیم کی وضعِ اصطلاحات پر ان کا نہایت مفصل ریویو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جس میں وہ اردو کو ترقی دینے کے لیے جو تجاویز دیتے ہیں ان میں کتابوں کے ناموں، بابوں اور فصلوں کے عنوانوں کے لیے اردو تراکیب کے استعمال کی ترغیب دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کتاب کے ابواب کی گنتی بابِ دوم بابِ سوم وغیرہ کے بجائے دوسرا باب تیسرا باب کی صورت میں ہونی چاہیے تاکہ اُردو کے اُردو پن کو نہ صرف برقرار رکھا جا سکے بلکہ اسے تسلسل دیا جا سکے۔ ''بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق'' کے زیرِ عنوان اپنے معروف مضمون کے آخر میں زیرِ سطح وہ ان حضرات سے ناخوش نظر آتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ اُردو الفاظ و تراکیب استعمال نہیں کرتے بلکہ ایسے الفاظ و محاورات کی تعریب بھی کر ڈالتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> بنگال کے بعض مسلمان بزرگوں کو میں نے 'غول مال' بولتے سنا ہے۔ گول مال کی شاید تعریب فرمائی ہے۔ دور کیوں جایئے خود ہمارے ہاں ایسے لوگ ابھی موجود ہیں جو 'بیگم' کو 'بیغم' اور 'کاغذ' کو 'قاغذ' بولتے ہیں۔[۲۹]

اُردو کے اردو پن پر اسی اصرار کے باعث وہ مکتوب الیہم کو ''مکتوب الیہوں'' (''مکتوب الیہوں کے حالات جمع کر کے شائع کیے جائیں''۔ تحقیق شمارہ ۱۲، ۱۳: ص ۳۳۷) لکھتے ہیں اور فارسی اور عربی کے ان لفظوں کو جو سہ حرفی ہیں اور درمیان کے حرف کے سکون کے ساتھ ہیں مثلاً فِکر، شمع، تخت، شہر وغیرہ، ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ لفظ بیچلے حرف کی حرکت کے ساتھ فصیحوں کی زبان پر جاری ہیں اور یہی صحیح ہیں۔ یوں کہہ کر وہ ولی کے اس طرح کے تلفظ کردہ لفظوں کا دفاع کرتے ہیں[۳۰] اور اس ضمن میں ناصؔر علی سرہندی کا ایک مصرع بطور حوالہ درج فرماتے ہیں:

بتِ فرنگی بہ قتلِ ہمنا رکھے جو پُر چیں جبیں دمادم

اور عربی لفظ کی ہندی لفظ سے ترکیب دینے پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہاں دو امور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ زبان کے تشکیلی دور کے شعرا، آج جب اردو زبان بہت منجھ چکی ہے، ہمارے لیے سند نہیں بن سکتے۔ دوسرے یہ کہ سہ حرفی لفظوں مثلاً عقل، شہر، تخت وغیرہ کا درمیانی حرف کی

حرکت کے ساتھ فصحا کی زبانوں پر جاری ہونے کا دعویٰ بھی محلِ نظر ہے اور اگر ایسا ہے بھی تو یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ ان الفاظ کو حرکت کے ساتھ ہی قبول کرلیا جائے۔ تقریر کی زبان اور تحریر کی زبان میں یوں بھی فرق ہوتا ہے اور ہمیشہ رہا ہے۔ اگر ولیؔ دکنی، ناصؔر علی سرہندی یا تشکیلی دور کے دیگر شعرا کے نظائر ہمارے لیے سند ہوسکتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ممتاز لغت نگاروں (مثلاً سید احمد دہلوی، نورالحسن نیّر کاکوروی یا صاحبِ فرہنگِ شفق) نے انھیں بطور مثبت امثال ونظائر کے برتا ہے؟ میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں ہے۔ اگر برتا بھی ہو تو یہ لکھ دینے کا اہتمام ضرور موجود ہے کہ اب یہ لفظ یا ترکیب متروک ہے یا قوسین میں وضاحت موجود ہے کہ غلط العوام ہے جیسا مثلاً فوق البھڑک وغیرہ۔

ڈاکٹر صدیقی کو اردو زبان اور اس کے لسانی مسائل ومعاملات کے ساتھ ساتھ اس کے ادبیات سے جو غیر معمولی ربط وتعلق تھا، امتیاز علی عرشی کے نام ان کے بعض مکاتیب اس پر شاہد ہیں مثلاً ایک خط میں خواجہ احسن اللہ دہلوی بیاںؔ (یا بہ روایت دیگر خواجہ احسن الدین خان بیاںؔ[۳۱]) کے مختصر دیوان کا ذکر کرتے ہیں جس میں شامل دو مثنویاں ''چیک نامہ'' اور ''تعریف چاہِ مومن خاں'' کلیاتِ سوداؔ کے نولکشوری ایڈیشن میں بھی الحاقی طور پر شامل ہیں۔ صدیقی صاحب کے پاس مذکورہ دیوان کا وہ نسخہ تھا جو خود شاعر کا اصلاح کردہ تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ کس قدر اہم تھا۔ افسوس صدیقی صاحب اس کی تدوین نہ کرسکے۔[۳۲]

اردو ادب ہی کے ایک زندہ اسم اسداللہ خاں غالبؔ سے بھی صدیقی صاحب کو گہرا لگاؤ تھا۔ انھوں نے غالب کی بعض نایاب تحریریں اپنے مقالے ''کچھ بکھرے ہوئے ورق'' میں شائع کی تھیں۔ اس مقالے میں منجملہ اور تحریروں کے غالب کے بعض اہم خط اور فسانۂ عجائب پر ان کی تقریظ شامل تھی۔ صدیقی صاحب نے ان تحریروں پر بہت عمدہ حواشی بھی لکھے تھے۔ انھوں نے خطوطِ غالبؔ مرتبہ مہیش پرشاد کی جلد اول پر نظر ثانی بھی کی تھی اور اس پر مقدمہ بھی لکھا تھا۔ علاوہ ازیں انشاے غالبؔ پر اُن کے مفصل اور مفید حواشی ''کچھ اور بکھرے ورق''، ''غالبؔ کے خطوں کے لفافے'' مکاتیبِ غالبؔ (مرتبہ امتیاز علی عرشی) پر مفصل تجزیاتی مقالہ، ''دہلی سوسائٹی اور مرزا غالبؔ'' ــــــ یہ سب غالبیات میں نادر اضافوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور غالب کی شخصیت وفکر کے تہہ رس مطالعات کی برہان مہیا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے کچھ مکاتیب میں بھی صدیقی صاحب نے غالب کے بعض لسانی معتقدات کے باب میں اپنا زاویۂ نگاہ بڑی صراحت سے بہ دلائل

بیان کیا ہے۔ غالبؔ پر ان تحریروں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب نے اُن کے باب میں کیسے کیسے اہم جزئیوں کو اِن تحریروں میں محفوظ کرلیا ہے مثلاً ''کچھ اور بکھرے ورق'' میں غالب کے ایسے مکاتیب شائع کیے گئے جو اب تک غیر مطبوعہ تھے۔ ان مکاتیب کے اصل متن خود غالبؔ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے جو صدیقی صاحب کے ہاتھ آئے۔ ''غالبؔ کے خطوں کے لفافے'' بظاہر ایک غیر اہم موضوع ہے لیکن اس سے بھی صدیقی صاحب نے کتنے اہم نکتے نکالے ہیں مثلاً یہی کہ ان لفافوں کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ غالبؔ نے جس طرح اپنی مکتوباتی تحریروں میں زوائد کو ترک کردیا تھا، لفافوں پر پتے کی عبارت میں بھی رفتہ رفتہ اختصار پیدا کرلیا تھا۔ پھر اپنے زمانے کے عام دستور کے خلاف غالبؔ بعض اوقات بجاے فارسی کے اردو میں پتے لکھا کرتے تھے وغیرہ۔ مکاتیبِ غالبؔ پر صدیقی صاحب کا مفصل ریویو پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاصرین کی تحریروں کو بھی کیسی عمیق تنقیدی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے محاسن کے دوش بدوش ان کی خامیوں اور کوتاہیوں سے بھی صرفِ نظر نہیں کرتے تھے۔ یہ مفصل تبصرہ بتاتا ہے کہ معیاری تدوین کے تقاضے کیا ہوتے ہیں، املا میں کن اصولوں کی پاسداری کرنی چاہیے، واقعاتی غلطیوں سے کیسے بچا جاسکتا ہے، حواشی کی طوالت کتنی ہونی چاہیے، بعض خاص اسما (معرفہ) کے سابقے کے سلسلے میں کیا احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے۔ صدیقی صاحب نے اپنے بڑے دلچسپ اور نہایت معلومات افزا مضمون ''دہلی سوسائٹی اور مرزا غالبؔ'' میں بتایا ہے کہ اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف میں سانحۂ ستاون کے چند برس بعد جو بہت سی علمی انجمنیں وجود میں آئی تھیں ان میں ایک دہلی سوسائٹی بھی تھی۔ اس کے بارے میں معلومات کا واحد ماخذ گارسیں دتاسی کی تحریریں تھیں مگر ان میں سوسائٹی کے بارے میں معلومات بیشتر تشنہ اور کہیں کہیں غلط تھیں۔ خوش قسمتی سے پنڈت کیفی کے توسط سے صدیقی صاحب کو سوسائٹی کے شائع کردہ چار شمارے دیکھنے کو مل گئے جن میں سوسائٹی کی سرگرمیوں کی تفصیلات اور بعض تحریریں چھپی تھیں جو اس سوسائٹی میں پڑھی گئی تھیں۔ سوسائٹی کی بنیاد اس زمانے کے دلی کے کمشنر کرنل ہملٹن کی تحریک سے پڑی اور اس کے ارکان میں ایک غالبؔ بھی تھے۔ انھوں نے سوسائٹی کے ایک جلسے منعقدہ ۱۱راگست ۱۸۶۵ء میں ایک مضمون پڑھا تھا جو سوسائٹی کے پہلے شمارے میں شائع ہوا۔ صدیقی صاحب نے اس کا متن رسالے سے نقل کرکے اپنے مقالے میں شائع کیا۔ اس مضمون کے علاوہ غالب سے متعلق کئی اہم معلومات اس مقالے میں یکجا کردی گئی ہیں جو حیاتِ غالبؔ کے ضمن میں بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔

مطالعاتِ غالبؔ کے ضمن میں ایک مبحث 'ز' اور 'ذ' کا بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ آیا گذشتن، پذیرفتن کو 'ذ' سے لکھنا چاہیے یا 'ز' سے۔ اس بحث کا آغاز غالبؔ کے اس مؤقف سے ہوا کہ فارسی زبان میں ذالِ معجمہ نہیں دالِ مہملہ ہے۔ صدیقی صاحب نے "ذالِ معجمہ فارسی میں" کے عنوان سے غالبؔ کے مؤقف کے برخلاف کثیر و قوی دلائل سے ثابت کیا کہ فارسی میں ذالِ معجمہ موجود رہی ہے۔ صدیقی صاحب غالبؔ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ موصوف کہتے تھے کہ ''ذ'' کا فارسی نہ ہونا ان کا اپنا نہیں ان کے نام نہاد آموز گار ''ہرمزد پارسی نژاد'' کا قول ہے جبکہ قصہ یہ ہے کہ غالبؔ کے اصل مآخذ فرہنگِ جہانگیری و رشیدی ہیں (مقالاتِ صدیقی، ص ۸۸)۔ یہی بات صدیقی صاحب نے عرشی کے نام ایک مکتوب میں بھی لکھی: ''غالبؔ علیہ رحمہ نے یہ خیال رشید ٹھٹھوی سے اخذ کیا ہے کہ ذالِ معجمہ فارسی میں نہیں ہے لیکن خان آرزوؔ نے ٹھٹھوی کے اس خیال پر اعتراض کیا ہے'' (نقوش بحوالۂ سابقہ: ص ۷۱)۔ فارسی ادبیات ولسانیات کے نامور عالم ڈاکٹر نذیر احمد کو بھی صدیقی صاحب کے موقف سے کامل اتفاق تھا۔ نقدِ قاطعِ برہان میں لکھتے ہیں:

> غالبؔ ذالِ فارسی کے منکر تھے حال آں کہ اس کے وجود سے انکار گویا بدیہیات سے انکار کے مترادف ہے۔ متعدد فاضلوں نے اس ضمن میں تفصیل سے مضامین لکھے ہیں۔ ہندوستان کے دو اہم دانش مندوں نے بھی اس موضوع پر مفصل گفتگو کی ہے۔ میری مراد ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب مرحوم اور قاضی عبدالودود صاحب سے ہے۔[۳۳]

تاہم ڈاکٹر نذیر احمد کو صدیقی صاحب سے اس امر میں اختلاف تھا کہ آٹھویں صدی عیسوی کے ختم ہونے تک 'ذ' نے 'ذ' کو پوری طرح بے دخل کر دیا تھا۔ انھوں نے عبدالوہاب قزوینی کے ایک قول سے استشہاد کرتے ہوئے لکھا کہ آٹھویں صدی کے بعد بھی ذالِ معجمہ ملتی ہے گو آہستہ آہستہ اس کا استعمال کم ہوتا گیا۔ نذیر احمد کے خیال میں نویں صدی کے وسط کے بعد تک ایسے نسخے ملتے ہیں جن میں ذال کا استعمال برابر نظر آتا ہے۔[۳۴]

صدیقی صاحب کا غالبؔ سے ربط و تعلق ایک مقلّد کا نہیں مجتہدانہ نظر رکھنے والے عالم کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں غالبؔ سے اتفاق و اختلاف کی متعدد صورتیں نظر آتی ہیں۔ عبدالصمد پارسی والے قصے کو وہ غالب کی گھڑنت سمجھتے تھے اور برہانِ قاطع والے مباحث کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ان سب کو یکجا شائع ہونا چاہیے۔ انھیں غالبؔ کے اس خیال سے شدید اختلاف تھا کہ ہندستان کے فضلا خان آرزوؔ،

غیاث الدین رامپوری (صاحب غیاث اللغات) اور رشید تتوی (صاحبِ فرہنگ رشیدی و معرّبات) تو منہ لگانے کے قابل نہیں مگر ''فضلائے کلکتہ'' (جنھوں نے برہان کی لغزشوں کو مانا تھا) بقول صدیقی ''گویا سیدھے ایران سے تشریف لائے تھے'' (نقوش بحوالۂ سابقہ: ص ۲۸) میرا خیال ہے کہ اس باب میں غالبؔ شدید دو عملی کا شکار رہے۔ معاملہ صرف یہیں تک نہیں۔ وہ غنیمتؔ کنجاہی کا ذکر بھی جا بجا حقارت سے کرتے ہیں مگر اپنی مثنوی ''چراغِ دیر'' میں کئی مصرعے اور ترکیبیں غنیمتؔ کی مثنوی نیرنگِ عشق سے اڑا لیتے ہیں۔[۳۵] ایک زمانے میں صدیقی تیغ تیز اور برہانِ قاطع کے مباحث کو خود مرتب کر کے شائع کرنا چاہتے تھے مگر اے بسا آرزو... ان کی اس آرزو کو ڈاکٹر نذیر احمد اور قاضی عبدالودود نے عملی جامہ پہنایا۔

چونکہ صدیقی صاحب بنیادی طور پر لسانی تحقیق کے آدمی تھے، ان کی عملی تنقید بھی لسانیات کی چار دیواری ہی میں اپنا روپ رس دکھاتی ہے۔ ان کی عملی تنقید کا ایک نمونہ تو مکاتیبِ غالبؔ پر مفصل محاکے کی صورت میں قبل ازیں زیرِ بحث آ چکا ہے۔ دیگر دو قابلِ توجہ اور دیر تک یاد رکھے جانے والے تنقیدی، لسانی مقالات وضعِ اصطلاحات (وحیدالدین سلیم) اور المبین (سید سلیمان اشرف) پر مفصل تجزیوں کی صورت میں لکھے گئے۔ مؤخر الذکر مقالہ معلوم نہیں کیوں مقالاتِ صدیقی میں جگہ نہ پا سکا۔ پہلے ہم وضعِ اصطلاحات پر ان کے افادات کا اجمالی ذکر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صدیقی نے وحیدالدین سلیم کی وضعِ اصطلاحات پر تبصرہ خود سلیم کی دعوت پر ۱۹۲۶ء میں لکھا۔ وحیدالدین سلیم نے اس تبصرے کو بہت سراہا۔ صدیقی صاحب نے اس تبصرے میں چند بڑی قابلِ بحث اور توجہ طلب باتیں لکھی ہیں۔ دیگر بہت سارے جدید ماہرینِ لسانیات کی طرح صدیقی صاحب بھی اس نظریے کے مؤیّد تھے کہ زبان انسان کے ساتھ ہی وجود میں آئی۔[۳۶] گو کہ ان ابتدائی مدارج میں ذخیرۂ الفاظ بہت کم تھا۔ انھوں نے لفظ آسمان کے بارے میں لکھا کہ انسان کی ابتدائی تاریخ اس قیاس کو جنم دیتی ہے کہ اسے پہلے آسمان نظر آیا۔ چکی (آسیا) بنانے کی نوبت تو بہت بعد میں آئی ہو گی سوا یسا نہیں کہ آسیا سے لفظ آسمان بنا ہو۔ پھر یہ بھی کہ قدیم فارسی میں آسمان دراصل اَسْمَن تھا، پہلوی میں آ کر آسمان بنا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ مان (جو حقیقت میں من تھا) مانند کے معنی نہیں رکھتا۔ آس مخفف ہے آسیا یا آسیاو کا۔ صدیقی صاحب کے نزدیک ''آسیاو'' صرف پہلوی میں ملتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے سلیم کے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کیا کہ ''خر''

والے مرکبات میں خر ''بزرگ'' کے معنی میں آتا ہے۔ ان کے خیال میں ''خر'' ''خُرّہ یا خَرّہ کی ایک صورت تھی جس کے معنی جاہ و جلال اور شان و شوکت کے ہیں لہٰذا خرگاہ سے مراد بڑا خیمہ نہیں، شان و شوکت والی جگہ ہے۔ انھوں نے اس وسیع طور پر پھیلے ہوئے خیال کی بھی تغلیط کی کہ ''زند'' کوئی زبان ہے۔ ''زند'' دراصل ''اوستا'' کے متن کا کئی صدی بعد ترجمہ ہے... لوگ غلطی سے زند اور پازند دونوں کو زبانیں سمجھ بیٹھے (مقالات صدیقی، ص۲۶۳)۔ ان کے نزدیک یہ غلط فہمی سب سے پہلے یورپی محققوں نے پھیلائی۔ انھوں نے شہاب الدین احمد خفاجی کے حوالے سے اس قیاس آرائی کی بھی تردید کی کہ ''ہیولیٰ'' ''ہیئتِ اُولیٰ'' کا مخفف ہے۔

۱۹۲۹ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ممتاز استاد سید سلیمان اشرف نے المبین کے نام سے ایک عمدہ اور مباحث خیز کتاب لکھی۔ اس کی تسوید کا بڑا محرک یہودی مستشرق جرجی زیدان کی کتاب فلسفۃ اللغۃ العربیہ بنی جس میں اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ عربی زبان مختلف زبانوں سے مستعار الفاظ کا ملغوبہ ہے۔ عربی میں مادہ ثنائی ہے ثلاثی نہیں اور تیسرا حرف جو زائد ہوتا ہے اس کا مقام متعین نہیں وہ اول، آخر، اوسط کہیں کا بھی ہو سکتا ہے۔ نیز عربوں نے ایک لفظ کہیں سے پا کر اس کے معنی سیکھ لیے اور پھر اسی ایک لفظ کو الٹ پلٹ کرتے چلے گئے تا آنکہ عربی زبان میں الفاظ کی کثرت نظر آنے لگی۔ سلیمان اشرف صاحب نے جرجی زیدان کے ان خیالات کی تردید کی اور عربی زبان کے فضائل، عربی زبان کا حیرت انگیز کمال گویائی، فلسفۂ ارتقائے زبان اور فلسفۂ اشتقاق جیسے موضوعات پر لکھ کر یہ ثابت کرنے کی سعی کی کہ ''عربی زبان میں جب کوئی لفظ موضوع قرار پاتا ہے تو اس کا بامعنی ہونا ایسا مستحکم و مضبوط ہوتا ہے کہ جس پہلو سے اس کو لوٹا پھیرا جائے وہ موضوع ہی رہتا ہے (یعنی مہمل نہیں ہوتا)۔ ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف منتقل ہونے پر بھی معنی کا ساتھ نہیں چھوٹتا۔'' (المبین، ص۴۷) گویا جب کسی موضوع لفظ کو اس کی ساری ممکنہ ہیئتوں (جو چھے سے زیادہ نہیں ہو سکتیں) کی طرف تبدیل کرتے جائیں اور ہر تبدیلی میں وہ لفظ بامعنی رہے تو اسے اشتقاقِ کبیر کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد صاحبِ المبین نے ق م ر (قمر) سے اشتقاقِ کبیر کی مثالیں دی ہیں جو بظاہر بہت حیران کن لسانی صورتِ حال کا باعث بنتی ہیں۔ مصنف نے اسی عمل کو اشکالِ ستہ کے ذریعے بتیس مثالوں تک پھیلا دیا ہے!

ڈاکٹر صدیقی نے اس کتاب پر ''المبین پر تعقب و تبصرہ'' کے زیرِ عنوان معارف کے ۲۵ صفحات پر مشتمل ایک مفصل تجزیاتی مقالہ لکھا اور مصنف کے بعض دعاوی کو دلائل اور متانت سے ردّ کیا۔ ان کے خیال میں

عربی زبان کے محققوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ عربی اور عجمی میں وہی نسبت ہے جو عجمی زبانوں اور جانوروں کی آوازوں میں ہے۔ ان کے مقالے کے دیگر اہم نکات کچھ یوں تھے:

۱۔ حروف تہجّی کے مخرج کا تعین کرنا صوتیات کے ماہروں کا کام ہے نہ کہ خود زبان کا۔

۲۔ ایسی زبان کا وجود محال ہے جس میں یہ آزادی ہو کہ بولنے والا کسی آواز کو جہاں سے اس کا جی چاہے ادا کرے۔

۳۔ مصنف کی ساری کوشش عربی زبان کو افضل ترین زبان ثابت کرنا ہے مگر یہ راہ تو سیدھی ترکستان کو گئی ہے۔

۴۔ مصنف المبین نے نہ صرف تاریخی ملاحظات کو بالاے طاق رکھا بلکہ السنہ کے اثریات اور تاریخی مواد کا مطالعہ کرنے والوں کی تضحیک کی۔

۵۔ جب کسی لفظ کی اصل کی تحقیق کی جاتی ہے تو اس کے ابتدائی مفہوم سے بحث کی جاتی ہے اور مرادی یا تشبیہی معنی یا وہ معنی جو بعد کو پیدا ہوئے، بحث سے قطعاً خارج کر دیے جاتے ہیں۔

۶۔ مصنف نے بعض لفظوں کے معانی نکالنے میں بہت کھینچ تان کی ہے۔

۷۔ مستشرقین کا ماخذ جرجی زیدان یا فون ڈائک کی تصانیف نہیں، ان کا ماخذ انھی بزرگوں کی تصانیف ہیں جنھوں نے اسلام کے عہدِ زرّیں میں علومِ عرب کی بنیاد رکھی تھی۔

۸۔ عربی کے اندر مادّہ بلاشبہہ سہ حرفی ہے، اس کے دو حرفی ہونے کی بحث محض عربی سے متعلق نہیں بلکہ اس قدیم سامی زبان سے متعلق ہے جس سے تمام سامی زبانیں (عربی، آرامی، عبرانی وغیرہ) نکلی ہیں۔ یہ بات صاحبِ المبین کی نظر میں اس لیے نہیں آسکی کہ وہ تاریخ سے بحث کرنا جائز نہیں سمجھتے۔

۹۔ المبین کی بنیاد فلسفۂ اشتقاق پر رکھی گئی ہے مگر اہلِ لغت ''اشتقاقِ کبیر'' کو تسلیم نہیں کرتے۔

۱۰۔ سیوطی کے نزدیک صرف ''اشتقاقِ اصغر'' مستند ہے۔ ''اشتقاقِ اکبر'' محققوں کی نگاہ میں کوئی چیز نہیں۔ یہ زبان میں موجبِ فساد ہے۔

۱۱۔ لسانیات کا غیر جانبدار فن ایک زبان کی دوسری زبان پر برتری ثابت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

۱۲۔ مصنف کا یہ خیال کہ یورپ کے علما کی رائے میں عربی کوئی مستقل زبان نہیں، سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے مستشرق یا غیر مستشرق کسی نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا۔

ڈاکٹر صدیقی کے اس تجزیے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ المبین پر بڑی حد تک ایک عالمانہ

تبصرہ ہے اور ہر عہد کے مستند مصنفین اور ماہرین السنہ کے دلائل سے پوری طرح لیس۔ اس تبصرے کے جواب میں مولانا اکرام اللہ خان ندوی اور مفتی عبداللطیف صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے استدراک معارف ہی کے بعد کے شماروں میں شائع ہوئے۔ ان میں اول الذکر کا جواب زیادہ قابلِ توجہ ہے کیونکہ اس میں صدیقی صاحب کے بعض نکات کا رد اس بنیاد پر کیا ہے کہ انھوں نے المبین کے بعض مباحث کا غور سے مطالعہ نہیں کیا۔ اکرام اللہ صاحب نے بعض بہت عمدہ لغوی بحثیں کی ہیں مگر اوراق کی تنگ دامانی ان کے ذکر سے مانع ہے۔ لازم ہے کہ ان مباحث کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تاکہ اور کئی علمی نکات سامنے آسکیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر صاحبِ المبین اپنے مباحث کو محض مادّے کے ثنائی ہونے کے رد تک محدود رکھتے اور ''اشتقاق کبیر'' کے پھیر میں نہ آتے تو ان کی کتاب زیادہ مؤثر اور بامعنی ہوتی۔

ڈاکٹر صدیقی صاحب کی، لسانی مباحث کی حامل تحریروں سے ہٹ کر بھی کچھ ایسے مضامین ہیں جو لائقِ توجہ ہیں جیسے مثلاً حافظ محمود شیرانی کی وفات پر ان کا مضمون جس میں انھوں نے حضور اکرمؐ پر ڈاکٹر ہنری سٹبے Stubbe کی پردۂ خفا میں کئی صدیوں سے مستور کتاب کو منظرِ عام پر لا کر اس کی حیاتِ نو کا اہتمام کرنے پر شیرانی کو داد دی اور اسے ان کا پہلا شان دار علمی کام قرار دیا۔[۳۷] اسی طرح وحید الدین سلیم پانی پتی[۳۸] اور ڈاکٹر اشپرنگر[۳۹] پر ان کے مضامین بھی بہت سے شخصی اور علمی نکات کو آئینہ کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر شخصیت پر ان کا مقالہ خاص طور پر چشم کشا اور انکشاف خیز ہے خصوصاً اس کے وہ اقتباسات جو صدیقی صاحب نے اشپرنگر کی حضور اکرمؐ پر جرمن کتاب سے براہ راست ترجمہ کر کے شاملِ مضمون کیے۔ اسی طرح صدیقی صاحب کے مقالے ''معائبِ سخن کلامِ حافظؔ کے آئینے میں'' اور ''شاہجہان کی ایک مثبت کار تصویر'' (مطبوعہ آج کل، دہلی، ستمبر ۱۹۵۰ء) بھی دامنِ دل کھینچتے ہیں۔

وسعتِ مطالعہ، عمق نگاہی اور آرائش و زیبائش سے پاک علمی اسلوب کی حامل ڈاکٹر صدیقی کی تحریریں ایک مستقل حوالے کی چیز ہیں۔ وہ علم و لسان کو آب بند خانوں میں اسیر کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ بہت کم مقامات ہیں جہاں ان کی تحریروں سے اختلاف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر بہر حال ایسے مقامات ہیں ضرور۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ''عبدالستار صدیقی مرحوم اور ان کی لسانی تحقیقات'' میں بعض لسانی امور پر ڈاکٹر صدیقی سے جائز اختلاف کیا ہے مثلاً لفظ ''کھیدا'' ہاتھی کو پکڑنے کا گڑھا نہیں، ہاتھی کو گھیر کر

(یعنی ہانکا کر کے) قید کرنے کے معنوں میں ہے۔ انھیں اس سے بھی اتفاق نہیں کہ ''سِکرّ'' ''مکرّ'' کا تابع مہمل ہے۔[۴۰] خود شوکت سبزواری سے بھی اس مضمون میں ایک سہو ہوا ہے جہاں انھوں نے صدیقی صاحب کی علمی تحصیلات کے ضمن میں لکھا ہے کہ انھوں نے سیبویہ کی الکتاب پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی، درآں حالیکہ صدیقی صاحب کا پی ایچ ڈی کا موضوع تھا: کلاسیکی عربی میں فارسی کے مستعار الفاظ۔ مقالہ جرمن زبان میں لکھا گیا تھا۔

ابنِ درید پر انگریزی میں لکھے گئے عالمانہ مقالے کے آخر میں صدیقی صاحب نے جمھرۃ اللغہ کا مستعار الفاظ والا باب درج کیا ہے۔ اس میں ایک مقام پر ابنِ درید نے لفظِ ''برجیس'' کی تشریح میں لکھا ہے:

والبِرجیس ویقال البِرجیس نجم من نجوم السمآء و یقال ھو بھرام

ابن درید کا یہ کہنا کہ ''برجیس'' کو ''بہرام'' بھی کہا جاتا ہے درست نہیں۔ برجیس فلکِ ششم کا سیّارہ ہے اور سعد ہے جبکہ بہرام فلکِ پنجم کا سیّارہ ہے اور مرّیخ کہلاتا ہے۔ اس کا رنگ سرخ ہے سو اسی نسبت سے اسے جلادِ فلک بھی کہتے ہیں۔ یہ نحس ہے، چنانچہ مرّیخ (بہرام) و زُحل ایک برج میں آئیں تو اسے ''قِران النحسین'' کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ابنِ دُرید کے اس سہو پر ڈاکٹر صدیقی کو حاشیہ لکھنا چاہیے تھا۔

اِسی طرح اپنے مقالے ''اُردو املا'' میں ایک جگہ صدیقی ذرّہ اور ذرا کو زیر بحث لا کر لکھتے ہیں کہ ذرّہ تشدید کے ساتھ ''کسی چیز کا بہت چھوٹا ٹکڑا'' کے معنوں میں آتا ہے جبکہ ذرا معنوی طور پر ذرّہ سے مختلف ہے لہٰذا اسے ذرا کے بجائے زرا لکھنا چاہیے۔ قیاس چاہتا ہے کہ ذرا کے پیدا ہونے کا باعث ذرّہ ہی ہے تو پھر اس کو ذال کے بجائے ز سے لکھنے پر اصرار کیوں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لفظ فارسی میں انھی معنوں میں آتا ہے جیسے اردو میں یعنی بہت کم۔ تھوڑا۔ ایرانی کہے گا: معنیِ رحم ذرّہ ای در دل او نیست یا ذرہ ای سود نہ بخشید (یعنی ذرا بھی فائدہ نہ ہوا)۔ فارسی میں یہ ذرا کے معنی ہی میں مستعمل ہے اور ذال ہی سے لکھا جاتا ہے۔ خود اردو میں اس کا املا ذال ہی سے رہا ہے اور ہے۔ جب مستند اہلِ علم تک اسے ذال سے لکھتے ہیں تو پھر اسی املا کو فصیح اور معتبر سمجھنا چاہیے۔ علاوہ ازیں اردو شعرا میں بھی خال خال ذرّہ بمعنی ذرا استعمال ہوا ہے۔ صبا کا شعر ہے:

ذرّہ بھی نہیں ہے زرِ قاروں کی یہاں قدر
دنیا کو سمجھتے ہیں ترے در کی گدا خاک

ڈاکٹر صدیقی کی گہری، ہمہ گیر اور وسعتِ نظر کی حامل لسانی اور دیگر تحریریں اس کی متقاضی تھیں کہ ان پر تفصیل سے لکھا جاتا مگر افسوس ہے کہ ان کی عظمت کا بہت کم اعتراف کیا گیا۔ عبدالستار دلوی کا مقالہ ''اردو میں لسانی تحقیق کی اہمیت''، تحقیق پر شائع ہونے والے کئی منتخبات کا حصہ بنا مگر مرتبین میں سے کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ اس میں عبدالستار صدیقی کے عدم شمول کا سبب کیا ہے؟

اہلِ علم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ تاریخی لسانیات بنیادی طور پر حرکی مزاج کی حامل ہے۔ یہ زبان کا مطالعہ اس میں ہونے والے تغیرات کے حوالے سے کرتی ہے۔ ایسے تغیرات جو زبان میں زمان و مکان دونوں حوالوں سے آتے ہیں۔ ان تغیرات کا تعلق تاریخی عناصر سے ہوتا ہے۔ تاریخی لسانیات سے کام لینے والے، کتبوں اور قدیم و عہدِ وسطیٰ کی تحریروں اور آثار سے مدد لیتے ہیں۔ تاریخی لسانیات اپنی بنیاد تحریری شہادتوں پر رکھتی ہے۔ پھر یہ بھی دیکھتی ہے کہ خاص زبانوں کے مابین تاریخی رشتے کیا ہیں۔ یوں اس کے ڈانڈے تقابلی لسانیات سے جا ملتے ہیں۔ پھر کوئی زبان یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس میں مستعار الفاظ کا ذخیرہ نہیں۔ لسانیات کے محققوں مثلاً ماریو پائی وغیرہ کا خیال ہے کہ انگریزی زبان کا اپنا اینگلوسیکسن ذخیرہ ۲۵ فیصد سے زیادہ نہیں۔ پچھتّر فی صد ذخیرۂ الفاظ مستعار ہے۔ مستعار لینے والی زبان یا تو اُس لفظ کو اپنے صوتی و صورتی نظم پر ڈھال لیتی ہے جیسے پرانی فرانسیسی کا لفظ "Verai" انگریزی کے "Very" میں ڈھل گیا یا پھر یہ کہ مستعار لینے والی زبان اُس لفظ کو اپنی زبان میں ترجمہ کر لیتی ہے۔ یہ اور اس طرح کے متعدد لسانی حقائق تھے جن سے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اپنی انگلیوں کی آخری پوروں تک آگاہ تھے۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقی تگ و دو کے لیے جو میدان چنا وہ عام لوگوں کی دلچسپی سے کوسوں دور ہی نہ تھا، اپنے مخصوص دائرے میں محدود بھی تھا۔ شاید ان کی عدم مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی رہا ہوگا مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ عبدالستار صدیقی جیسے بے مثال ماہر السنہ کو بھول جانا اپنی تہذیبی بے مائیگی اور لسانی بے چہرگی کے اعلان کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود اور ان کے رفقاے کار لائقِ مبارک باد ہیں کہ ان کے توسّط سے ایک مدّت کے بعد ایک خصوصی اشاعت کے ذریعے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے علمی و لسانی افادات کی بازیافت اور باز تحقیق کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* ناظم مجلسِ ترقی ادب، لاہور۔

۱۔ سید سلیمان ندوی، شذرات سلیمانی، حصہ دوم (اعظم گڑھ، ۱۹۹۷ء)، ص ۲۷۸۔

۲۔ معرّبات رشیدی کے فاضل مدونِ نو ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب نے ''سوانحِ مرتب'' کے زیرِ عنوان، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی پر اپنی مفید معلومات کی حامل تحریر میں اس قول کو شبلی سے منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے: ''یہ بھی خیال رہے کہ مولانا شبلی کی یہ رائے اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب صحیح معنوں میں صدیقی صاحب کی علمی تحقیقات کا آغاز بھی نہ ہوا تھا''، ص ۲۳۔ شیرانی صاحب کو تسامح ہوا ہے۔ یہ قول صریحاً شاگردِ شبلی سید سلیمان ندوی کا ہے، شبلی کا نہیں اور مقالات صدیقی کے ص ۱۰۴، ۱۰۵ پر درج ہے جہاں اُنھوں نے صدیقی کی استدراکی تحریر کو ''بیش قیمت مقالہ'' قرار دیا ہے۔

۳۔ عبدالستار صدیقی، مقالات صدیقی مرتب مسلم صدیقی، جلد اول (لکھنؤ، ۱۹۸۳)، ص ۱۰۵۔ دوسری زبانوں میں آ کر لفظ کیوں متغیر ہو جاتے ہیں اس کی دلچسپ تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ ہو سہیل بخاری کی کتاب لسانی مقالات، جلد سوم (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۸۔۲۰۔

۴۔ یہ مقالہ *Allahabad University Studies* کی جلد VI، حصہ اول میں "Ibn Duraid and His Treatment of Loan-words" کے زیرِ عنوان شائع ہوا تھا۔ زیرِ نظر مقالے میں اس کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔

۵۔ نقوش لاہور، خطوط نمبر ۳ (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء): ص ۳۲۔ زیرِ نظر مقالے میں راقم المبین پر صدیقی صاحب کے مقالے اور دیگر متعلقہ تحریروں سے بھی اعتنا کرے گا۔

۶۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۱۳۔

۷۔ صحن یک خانہ کیجیے چھڑکاب۔

۸۔ ''بغداد'' کو بطور ''باغ داد'' ذکر کرنے والوں میں صدیقی صاحب سے پہلے احمد دین مصنف سرگذشتِ الفاظ کا نام بھی آتا ہے۔ احمد دین (م۔ ۱۹۲۹ء) لکھتے ہیں: ''کسی لفظ کی نسبت یہ احتمال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے ماخذ کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو گیا ہے اور اپنی پرورش اور نشوونما اسی ماخذ سے یہاں تک پا رہا ہے کہ اس سے الگ ہونا اور آزاد زندگی کا حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا ہے بغداد- باغ داد- کو ابھی تک بغداد کہے جانے میں بیہودگی نہیں___سرگذشت الفاظ (لاہور: مطبع کریمی، ۱۹۲۳ء)، ص ۱۶۸۔

۹۔ مقالات صدیقی، ص ۱۳۴۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۳۔

۱۱۔ رک تحقیق، سندھ یونی ورسٹی، جامشورو، شمارہ ۱۲، ۱۳: ص ۶۱۵، ۶۱۶۔

۱۲۔ میرے خیال میں تو یہ لفظ ''انتیا'' ہونا چاہیے یعنی انجام، خاتمہ، موت۔

۱۳۔ احمد دین، سرگذشت الفاظ، ص ۲۷۴۔

۱۴۔ "Ibn Duraid and His Treatment of Loan-words"، مشمولہ *Allahabad University Studies* Vol. VI, Part-1 (الہ آباد، ۱۹۳۰)، ص ۶۸۰۔

۱۵۔ مقالات صدیقی، ص ۱۶۷۔ اسی لسانی حقیقت کو ایک دوسرے جغرافیائی تناظر میں یوں بیان کرتے ہیں: ''بعضے لفظ ایسے ہیں کہ

کئی سو برس ہوئے ہندستان میں اپنے اصلی معنوں میں رائج ہوئے اور اب تک بولے جاتے ہیں مگر خود ایران میں ان کا مفہوم بدل گیا'' ___ مقالات صدیقی، ص۱۱۸۔

۱۶۔ رسالہ معرّباتِ رشیدی (کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۲۰۰۳ء)، ص۱۱۔

۱۷۔ مقالات صدیقی، ص۵۳، ۵۴۔

۱۸۔ سید عبداللہ، ''نوادر المکاتیب''، اردو نامہ کراچی، شمارہ ۴۴، ۴۵ (مارچ ۱۹۷۳ء): ص۵۹۔

۱۹۔ ایضاً، ص۵۸۔

۲۰۔ ایضاً، ص۸۴۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ ایضاً: ص۸۵۔

۲۳۔ نقوش خطوط نمبر ۳: ص۳۶۔

۲۴۔ ''بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق''، مشمولہ مقالاتِ صدیقی جلد ۱، ص۱۲۰، ۱۲۱۔

۲۵۔ ''کچھ بکھرے ہوئے ورق''، ہندستانی (اکتوبر ۱۹۳۳ء): ص۴۸۲۔ ہندستانی میں چھپنے والا یہ دلچسپ مقالہ اس لحاظ سے اور بھی اہم ہے کہ اس کا اوف پرنٹ صدیقی صاحب نے پنڈت کیفی کو بایں عبارت پیش کیا: ''نوروز ۳۴ء کا تحفہ میرے محبّ مکرم پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی کی خدمت میں''۔ یہ اوف پرنٹ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ کیفی میں محفوظ ہے۔

۲۶۔ صدیقی صاحب کے موقف کی تفصیل جاننے کے لیے رک اردو نامہ بحوالۂ سابقہ: ص۶۱۔

۲۷۔ مثلاً آج بھی بیشتر اردو والے اِن شاءاللہ کو ملا کر انشاءاللہ لکھتے ہیں۔ اس ضمن میں مختار الدین احمد کے نام ۱۰ مارچ ۱۹۴۴ء کے خط میں صدیقی صاحب کا موقف ملاحظہ ہو: ''صاحبِ جہانگیری اور صاحبِ دستور عجم اور جانے کس نے اور کس نے لکھا ہے کہ انشاءاللہ لکھنا چاہیے۔ میں نے کہا ہاں ان بزرگوں سے تلمذ کا شرف مجھے نہیں ہے کہ اِن شاء اور انشاء کے فرق کو بھول جاؤں'' ___ تحقیق، شمارہ ۱۲، ۱۳: ص۶۱۲۔

۲۸۔ اردو املا (دہلی، ۱۹۷۴): ص۳۳۔۳۴۔

۲۹۔ مقالاتِ صدیقی، ص۱۲۳۔

۳۰۔ صدیقی صاحب کے مؤقف کی تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ ہو: مقالاتِ صدیقی، ص۲۳۵۔۲۳۶۔ جہاں انھوں نے ولی دکنی کی زبان پر ہونے والے اعتراضات کا دفاع کیا ہے۔

۳۱۔ اور یہی درست ہے۔ رک (جالبی) تاریخ ادب اردو، جلد دوم، حصہ اول کا حاشیہ ص۴۰۷۔

۳۲۔ نقوش خطوط نمبر ۳: ص۴۹، ۵۰ پر تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ دیوان بیان ۱۹۷۸ء میں دہلی سے ثاقب رضوی نے شائع کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر ارجمند آرا نے اسے چار قلمی نسخوں کی مدد سے مدوّن کر کے ۲۰۰۴ء میں انجمن ترقی اُردو دہلی سے شائع کیا۔ اس تدوین پر انھیں JNU سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔

۳۳۔ ڈاکٹر نذیر احمد، نقد قاطع برہان مع ضمائم (دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء)، ص۲۲۔

۳۴۔ ایضاً، ص۳۳۰۔

۳۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مقالہ: ''مثنوی چراغ دَیر-ایک جائزہ''، مشمولہ غالب فکر و فرہنگ، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۳۶۔ ایک عرصے تک لسانیات کے ماہرین کے مابین یہ امر مابہ النّزاع رہا کہ زبان الہام سے ایجاد ہوئی یا ماحول اور نفس کی تحریک کے باعث خود انسان کے اندر سے پھوٹی۔ میرے خیال میں زبان کے انسان کے ساتھ وجود میں آنے کا مطلب ہے کہ زبان محض ارتقائی عمل کی محتاج ہے۔ مسلم علم کلام میں اشاعرہ اول الذکر نقطۂ نظر کے مؤیّد تھے اور معتزلہ دوسرے نقطۂ نظر کے۔ اس مبحث سے المبین کے مصنف نے بھی اعتنا کیا ہے۔ میرے نزدیک زبان کی ایجاد، تعمیر اور ارتقا میں فیض ربانی اور خونِ رگِ معمار دونو کی روشنی اور گرمی شامل رہی ہے۔

۳۷۔ تفصیل کے لیے رک رسالہ ہندستانی (اپریل و جولائی ۱۹۴۶ء)۔

۳۸۔ ملاحظہ کیجیے مقالات صدیقی، ص۲۴۱۔۲۵۷۔

۳۹۔ دہلی کالج میگزین کا قدیم دلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء، صفحات ۱۲۲-۱۲۷ ملاحظہ ہوں۔

۴۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے اُردو نامہ کراچی (مارچ ۱۹۷۳ء): ص۳۰۔۳۷۔

مآخذ

احمد، نذیر۔ نقدِ قاطع برہان مع ضمائم۔ دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء۔

بخاری، سہیل۔ لسانی مقالات۔ جلد سوم۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء۔

تحقیق۔ سندھ یونی ورسٹی جام شورو۔ شمارہ ۱۲، ۱۳۔

جالبی، جمیل۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد دوم، حصہ اول۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۲ء۔

خان، رشید حسن۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء۔

________۔ اردو املا دہلی۔ (۱۹۷۴ء)۔

دہلی کالج میگزین۔ قدیم دلی کالج نمبر (۱۹۵۳ء)۔

دین، احمد۔ سر گذشت الفاظ۔ لاہور: مطبع کریمی، ۱۹۲۳ء۔

شیرانی، مظہر محمود۔ ''سوانحِ مرتب''۔ معرّبات رشیدی۔ کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۲۰۰۳ء۔

صدیقی، عبدالستار۔ مقالات صدیقی۔ مرتب مسلم صدیقی۔ جلد اول۔ لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔

__________۔ ''بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق''۔ مقالات صدیقی۔ مرتب مسلم صدیقی۔ جلد اول۔ لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔ ص۱۲۰، ۱۲۱۔

__________۔ "Ibn Duraid and His Treatment of Loan-words"۔ *Allahabad University Studies*۔ جلد VI۔ حصہ اول۔ الہٰ آباد: ۱۹۳۰ء۔

عبداللہ، سید۔ ''نوادر المکاتیب''۔ اردو نامہ کراچی۔ شمارہ ۴۴، ۴۵ (مارچ ۱۹۷۳ء)۔

فراقی، تحسین۔ ''مثنوی چراغ دَیر-ایک جائزہ''۔ غالب فکر و فرہنگ۔ لاہور، ۲۰۰۰ء۔

ندوی، سید سلیمان۔ شذراتِ سلیمانی۔ حصہ دوم۔ اعظم گڑھ، ۱۹۹۷ء۔

نقوش لاہور۔ خطوط نمبر ۳ (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء)۔

ہندستانی (اکتوبر ۱۹۳۳ء)۔

________۔ (اپریل و جولائی ۱۹۴۶ء)۔